مسلسل اشاعت کے 60 سال

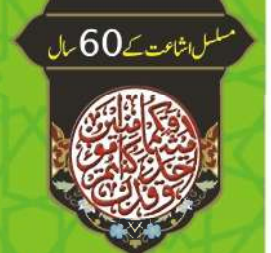

صفر المظفر ۱۴۴۸ھ

جولائی ۲۰۲۶ء

ماہنامہ

میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیم اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

- تواصی بالحق از ڈاکٹر اسرار احمدؒ
- سفرِ آخرت کے مراحل اور ہماری ذمہ داریاں
- قومی وحدت کا تقاضا: عدل، اعتماد اور مکالمہ
- حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو مَیں!

داعیٔ رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل
بیانُ القرآن
ترجمہ و مختصر تفسیر
کی شہرۂ آفاق پزیرائی اور مقبولیت
کے بعد اب پیش ہے:
فری ہوم ڈیلیوری کے ساتھ
مختصر
بیانُ القرآن
ترجمہ مع منتخب حواشی
مضبوط جلد
دیدہ زیب ٹائٹل
1248 صفحات
ڈیلکس ایڈیشن: 4500 کے بجائے 2200 روپے
سٹینڈرڈ ایڈیشن: 2500 کے بجائے 1500 روپے
مکتبہ خدّام القرآن لاہور
36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)
maktaba@tanzeem.org
0301-1115348

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

”اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!“

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

جلد : 75
شمارہ : 7
صفر المظفر 1448ھ
جولائی 2026ء
فی شمارہ : 60 روپے
سالانہ زرِتعاون : 600 روپے

مدیر مسئول
شجاع الدّین شیخ

مدیر اعزازی
حافظ عاکف سعید

مدیر
حافظ خالد محمود خضر

مجلس ادارت
• رضاء الحق • ایوب بیگ مرزا
• خورشید انجم • وسیم احمد

معاون مدیران
• محمد خلیق • حافظ محمد زاہد

رابطہ برائے ادارتی امور (042)38939321
publications@tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی ”دارالاسلام“ ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: 78-35473375(042)

ویب سائٹ www.tanzeem.org , www.tanzeemdigitallibrary.com

مکتبہ خدام القرآن لاہور، K-36، ماڈل ٹاؤن لاہور 54700

فون: 3-35869501 (042) ، 0341-4941212

ای میل: maktaba@tanzeem.org

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال ——— 5

قومی وحدت کا تقاضا:

عدل‘ اعتماد اور مکالمہ — رضاء الحق

درس قرآن ——— 9

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ(۹) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

ابوظبی سیریز ——— 42

تواصی بالحق — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

تذکیر و موعظت ——— 70

سفرِ آخرت کے مراحل

اور ہماری ذمہ داریاں — شجاع الدین شیخ

ظروف و احوال ——— 77

حیراں ہوں دل کو روؤں

کہ پیٹوں جگر کو مَیں! — ایوب بیگ مرزا

❁❁❁

’’ادارہ‘‘ کا مضمون نگار حضرات کی تمام آراء سے کامل اتفاق ضروری نہیں!

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قومی وحدت کا تقاضا: عدل‘ اعتماد اور مکالمہ

آزاد جموں وکشمیر میں حالیہ سیاسی کشیدگی‘ جوائنٹ عوامی ایکشن کمیٹی کے گرد پیدا ہونے والے تنازعات اور ۲۷ جولائی کے انتخابات کے حوالے سے سامنے آنے والی پیش رفت نے ایک مرتبہ پھر پاکستان کے سیاسی نظام‘ انتخابی عمل اور قومی یکجہتی سے متعلق کئی اہم سوالات کو موضوعِ بحث بنا دیا ہے۔ بظاہر یہ ایک علاقائی سیاسی معاملہ دکھائی دیتا ہے‘ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اِس کے اثرات آزاد کشمیر کی حدود سے کہیں آگے بڑھ کر پاکستان کے قومی بیانیے‘ مسئلۂ کشمیر اور ریاست وعوام کے باہمی تعلقات تک پہنچتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان معاملات کو محض انتظامی یا قانونی مسئلہ سمجھنے کے بجائے وسیع تر قومی اور نظریاتی تناظر میں دیکھنے کی ضرورت ہے۔

جمہوریت کے داعیان ہمیشہ یہ موقف اختیار کرتے ہیں کہ اقتدار کا اصل سرچشمہ عوام ہیں اور انتخابات وہ ذریعہ ہیں جن کے ذریعے عوام اپنی مرضی کے نمائندے منتخب کرتے ہیں۔ البتہ جب کسی سیاسی قوت کو انتخابی میدان میں اُترنے سے پہلے ہی مختلف قانونی‘ انتظامی یا ریاستی اقدامات کا سامنا کرنا پڑے تو لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عوامی رائے کی حقیقی حیثیت کیا رہ جاتی ہے! سیاسی اختلافات اور عوامی مطالبات سے نمٹنے کے لیے اگر طاقت اور پابندیوں کا راستہ اختیار کیا جائے تو اُس سے وقتی طور پر نظم ونسق تو قائم رکھا جا سکتا ہے‘ لیکن عوام کے دل میں پیدا ہونے والے شکوک وشبہات (جو مسلسل دباؤ کے باعث نفرتوں میں بدل سکتے ہیں) کا ازالہ نہیں کیا جا سکتا۔

آزاد جموں وکشمیر میں جوائنٹ عوامی ایکشن کمیٹی کا ظہور بھی دراصل ایسے ہی عوامی مسائل کے پس منظر میں ہوا تھا۔ مہنگائی‘ بجلی کے نرخ‘ انتظامی بدعنوانی اور عوامی مشکلات جیسے معاملات نے تاجروں اور سماجی طبقات کو متحرک کیا اور ایک ایسی تحریک وجود میں آئی جس نے

اپنے مطالبات کے حق میں آواز بلند کی۔ ان مطالبات کی نوعیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ صرف آزاد کشمیر کے عوام کا مسئلہ نہیں بلکہ پورے پاکستان کے عوام کم و بیش انہی مشکلات سے دوچار ہیں۔ ان شکایات کو محض سیاسی مخالفت سمجھ کر نظر انداز کرنا حقیقت پسندانہ طرزِ عمل نہیں ہوسکتا۔ اِس کے ساتھ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ موجود ہے کہ کسی بھی معاشرے میں احتجاج اور سیاسی جِدّوجُہد کو نظم و ضبط اور قانون کے دائرے کے اندر رہنا چاہیے۔ اسلام ہرگز اِس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ اختلافِ رائے کو انتشار، فساد اور ریاستی اداروں سے تصادم کی شکل اختیار کرنے دی جائے۔ قرآن مجید مسلمانوں کو اجتماعی نظم کی پابندی کی تعلیم دیتا ہے اور نبی اکرم ﷺ نے اُمّت کے اتحاد کو غیر معمولی اہمیت دی ہے۔ اگر ہر گروہ اپنی طاقت کے بل پر اپنی مرضی نافذ کرنے کی کوشش کرے تو معاشرہ انتشار کا شکار ہوجاتا ہے۔ اس لیے سیاسی قوتوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے مطالبات کو پُرامن اور آئینی طریقوں سے پیش کریں اور ریاستی اداروں کے ساتھ تصادم کے بجائے اصلاحِ احوال کی جِدّوجُہد کو ترجیح دیں۔

تاہم اِس اصول کا دوسرا پہلو بھی اتنا ہی اہم ہے۔ ریاست کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ عوامی مطالبات اور سیاسی اختلافات کو محض سکیورٹی کے مسئلے کے طور پر نہ دیکھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ سیاسی مسائل کا پائیدار حل ہمیشہ سیاسی عمل ہی سے برآمد ہوتا ہے۔ طاقت کا استعمال بعض اوقات ناگزیر ہوسکتا ہے، لیکن اِسے مستقل حکمتِ عملی نہیں بنایا جاسکتا۔ خصوصاً آزاد کشمیر جیسے حساس خطے میں، جہاں ہر سیاسی پیش رفت براہِ راست مسئلۂ کشمیر کے ساتھ جڑی ہوئی ہے، وہاں ریاستی اقدامات کے دُوررس اثرات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

یہ امر بھی پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ آزاد کشمیر اور گلگت بلتستان محض انتظامی اکائیاں نہیں بلکہ پاکستان کے اُس قومی موقف کا اہم حصّہ ہیں جس کی بنیاد کشمیری عوام کے حقِ خودارادیت (جسے اچھے وقتوں میں ''کشمیر بنے گا پاکستان!'' کے نعرے سے یاد کیا جاتا تھا) پر قائم ہے۔ پاکستان دنیا بھر میں یہ موقف پیش کرتا ہے کہ کشمیریوں کو اپنی سیاسی خواہشات کے اظہار اور اپنے مستقبل کے تعین کا حق حاصل ہونا چاہیے۔ ایسے میں اگر اُنھی علاقوں میں عوامی نمائندگی، سیاسی شرکت یا انتخابی شفافیت کے حوالے سے سوالات پیدا ہوں تو اِس کے اثرات صرف داخلی سیاست تک محدود نہیں رہتے بلکہ پاکستان کے بین الاقوامی موقف پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔

بدقسمتی سے گزشتہ چند برسوں کے دوران انتخابی عمل کے بارے میں عوامی اعتماد مسلسل کمزور ہوا ہے۔ فارم ۴۵ اور فارم ۴۷ جیسے معاملات پر ہونے والی بحث اِسی اعتماد کے بحران کی علامت ہے۔ مسئلہ کسی ایک جماعت یا ایک انتخاب کا نہیں بلکہ پورے سیاسی نظام کی ساکھ کا ہے۔ اگر عوام کو یہ یقین نہ رہے کہ اُن کا ووٹ واقعی فیصلہ کُن حیثیت رکھتا ہے تو پھر انتخابات محض ایک رسمی مشق بن کر رہ جاتے ہیں۔ سیاسی استحکام کی بنیاد صرف انتخابی نتائج نہیں بلکہ اُن نتائج پر عوام کے اعتماد میں مضمر ہوتی ہے۔

آزاد کشمیر کے موجودہ حالات میں سب سے زیادہ تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ سیاسی کشمکش اور ریاستی اقدامات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے چینی سے فائدہ صرف پاکستان مخالف قوتوں کو ہو رہا ہے۔ بھارت عرصۂ دراز سے یہ کوشش کر رہا ہے کہ مسئلۂ کشمیر کو پس منظر میں دھکیل دیا جائے اور کشمیری عوام کی جدّوجُہد کو کمزور کیا جائے۔ ایسے حالات میں داخلی انتشار، سیاسی تصادم اور باہمی عدم اعتماد درحقیقت دشمن کے بیانیے کو تقویت پہنچاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اِس معاملے کو محض قانون نافذ کرنے یا سیاسی برتری حاصل کرنے کے زاویے سے نہیں بلکہ قومی سلامتی اور مسئلۂ کشمیر کے تناظر میں دیکھا جانا چاہیے۔ ماضی میں مقبوضہ کشمیر کے وزیراعلیٰ اور نیشنل کانفرنس کے صدر فاروق عبداللہ اقوام متحدہ کی ہیومن رائٹس کونسل سے مطالبہ کر چکے ہیں کہ پاکستان کے زیراہتمام آزاد کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی تحقیقات کی جائیں۔

اِس صورتِ حال کا تقاضا یہ ہے کہ حکومتِ پاکستان معاملے کو فہم و فراست کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کرے۔ تمام سیاسی قوتوں، سماجی حلقوں اور متعلقہ فریقین کو اعتماد میں لے کر ایک جامع قومی مکالمے کا آغاز کیا جائے۔ آزاد کشمیر میں انتخابات کی شفافیت کو یقینی بنایا جائے اور ہر اُس سیاسی قوت کو، جو عوامی حمایت رکھتی ہے، پُرامن سیاسی عمل میں حصہ لینے کا موقع دیا جائے۔ ایک مؤثر آل پارٹیز کانفرنس اِس سلسلے میں مثبت پیش رفت ثابت ہو سکتی ہے جو نہ صرف کشیدگی کو کم کرے بلکہ مختلف حلقوں کے تحفظات دور کرنے میں بھی مدد دے۔

دوسری طرف اگر ہم اِس پورے مسئلے کی جڑ تک پہنچنے کی کوشش کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ صرف انتخابات، سیاسی جماعتوں یا کسی مخصوص تحریک کا مسئلہ نہیں۔ اصل بحران اُس فکر کا ہے جس کے تحت اقتدار کو ایک امانت اور فرض کے بجائے ایک حق اور غلبے کا ذریعہ سمجھا جاتا ہے۔

پاکستان کی سیاسی تاریخ بار بار یہ ثابت کرتی ہے کہ محض نئے قوانین‘ نئے انتخابی فارمولوں اور انتظامی اصلاحات سے مسائل مستقل طور پر حل نہیں ہوتے‘ کیونکہ خرابی نظام کے بنیادی تصور میں موجود ہے۔ اِس حوالے سے اسلام ایک بالکل مختلف تصورِ حکمرانی پیش کرتا ہے۔ اسلام میں حاکمیتِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ہے اور اقتدار انسانوں کی ذاتی ملکیت نہیں بلکہ ایک امانت ہے جس کا روزِ قیامت اللہ کے ہاں حساب دینا ہوگا۔ حکمران قانون سے بالاتر نہیں ہوتے بلکہ خود اللہ کے قانون کے پابند اور اللہ کے بعد عوام کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔ خلافتِ راشدہ کا نظام اِسی حقیقت کا عملی نمونہ تھا جہاں احتساب‘ شفافیت‘ عدل اور عوامی حقوق ریاستی ڈھانچے کا لازمی حصّہ تھے۔ وہاں اقتدار کا مقصد حکمرانی نہیں بلکہ اللہ کے احکام کے مطابق بندگانِ خدا کی خدمت اور عدلِ اجتماعی کی فراہمی تھا۔

حقیقت یہ ہے کہ پاکستان کے سیاسی‘ سماجی اور انتظامی مسائل کا مستقل اور پائیدار حل قرآن وسُنّت پر مبنی نظامِ خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کے قیام میں مضمر ہے۔ یہی وہ نظام ہے جو ایک طرف عوامی حقوق‘ عدل‘ احتساب اور شفافیت کی ضمانت فراہم کرتا ہے اور دوسری طرف قومی وحدت‘ ریاستی استحکام اور نظمِ اجتماعی کو بھی محفوظ بناتا ہے۔ لہٰذا ضرورت اِس امر کی ہے کہ قوم وقتی سیاسی تنازعات اور انتخابی کشمکش سے بلند ہو کر اس بنیادی سوال پر غور کرے کہ پاکستان کے قیام کا اصل مقصد کیا تھا اور اِس کے استحکام کی حقیقی بنیاد کیا ہو سکتی ہے! جب تک اقتدار کو امانت اور جواب دہی کو دینی فریضہ سمجھنے والا فکر غالب نہیں آتا‘ تب تک بحران اپنی مختلف شکلوں میں سامنے آتے رہیں گے۔ پاکستان کی سلامتی‘ مسئلۂ کشمیر کے مؤثر دفاع‘ عوامی اعتماد کی بحالی اور حقیقی عدلِ اجتماعی کے قیام کا راستہ اِسی فکر سے ہو کر گزرتا ہے جس کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور خلافت علیٰ منہاج النبوۃ پر قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ اہلِ اقتدار اور عوام سب کو مل کر پاکستان میں دینِ متین نافذ و قائم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

میثاق‘ حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن

تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

سُوْرَۃُ الْبَقَرَۃ (۹)

مدرّس: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

آیات ۲۶ تا ۲۹

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ؕ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ﴿۲۶﴾ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۲۷﴾ كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۹﴾

ان چار آیات میں مذکور چند مسائل ایسے ہیں جو مشکلاتِ قرآن میں سے ہیں۔ ان میں فلسفۂ قرآنی کا ایک موضوع تو ایسا ہے جس کے ضمن میں مَیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اس پر اُس نے مجھے بہت زیادہ انشراح عطا فرمایا ہے۔ اور یہ آج کی بات نہیں‘ ۱۹۶۶ء میں مَیں نے ایک مضمون ’’حقیقتِ زندگی‘‘ لکھا تھا‘ جس میں یہ نکتہ بیان کیا تھا۔ بہت سے نامور علماء نے بھی یہ تسلیم کیا کہ کسی کا ذہن اس نکتہ کی طرف مائل نہیں ہوا‘ جب کہ بات بالکل ایسی ہے جیسے سامنے کی ہو۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خصوصی فضل و کرم ہوتا ہے جو رزق ہی کی ایک صورت ہے۔ رزق کے لفظ کا اطلاق اصلاً صرف مادّی رزق پر ہی نہیں ہوتا

بلکہ اگر کسی کو اللہ تعالیٰ علم و معرفت کا رزق عطا فرمائے تو یہ بھی روحانی رزق ہے۔ چنانچہ یہ رزق کی مختلف شکلیں ہیں جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کی جاتی ہیں۔

آیت ۲۶ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ﴾ ''یقیناً اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ بیان کرے کوئی مثال مچھر کی یا اُس چیز کی جو اس سے بڑھ کر ہے۔''

گزشتہ آیت میں جنّت اور اس کے پھلوں کے تذکرہ میں لفظ ''مُتَشَابِهًا'' (ملتے جلتے' متشابہ) آیا ہے۔ سورۂ آلِ عمران کے آغاز میں فرمایا گیا کہ قرآن حکیم کی آیات دو طرح کی ہیں: محکمات اور متشابہات۔ ﴿مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ﴾ (آیت ۷) ''اس میں محکم آیات ہیں اور وہی اصل کتاب ہیں' اور کچھ دوسری آیتیں ایسی ہیں جو متشابہ ہیں۔'' متشابہات وہ ہیں جن کے حقیقی مفہوم کو ہم اس دنیا میں نہیں سمجھ سکتے۔ آخرت سے متعلق تمام امور متشابہات میں سے ہیں۔ بس یہ یقین ضروری ہے کہ دوبارہ اٹھائے جائیں گے' زندہ کیا جائے گا' حساب کتاب ہوگا' لیکن اُس کی کوئی تفصیلی ہیئت اور صورت ہمارے علم میں نہیں۔ میدانِ حشر کا تفصیلی نقشہ کیا ہوگا؟ وزنِ اعمال کی کیا کیفیت ہوگی؟ یہ ہم نہیں جان سکتے۔ قرآن کریم میں جنت اور دوزخ کے جو حالات اور کوائف آئے ہیں ان کے بارے میں ہمارا نقطہ نظر یہ ہونا چاہیے: ﴿اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ﴾ (آل عمران:۷) جو کچھ بھی قرآن میں آیا ہے ہم اُس پر ایمان رکھتے ہیں' یہ سب ہمارے ربّ کی طرف سے ہے۔ (اس کی کچھ تفصیل احادیث نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں مل جاتی ہے۔) البتہ مزید تفصیل میں جا کر کوئی نقشہ قائم کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے۔ یہ آیاتِ متشابہات ہیں۔

تمثیل اور تشبیہ کی اصل حقیقت

پہلے یہ چیلنج آچکا ہے کہ اگر تمہیں قرآن کے منزّل من اللہ ہونے پر شک ہے اور تمہارا یہ گمان ہے کہ یہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا اپنا کلام ہے جو آپؐ نے خود موزوں کر لیا ہے تو

پھر اس جیسی مثال تم بھی لے آؤ۔ اس چیلنج کو تو کسی نے قبول نہیں کیا۔ جوابی طور پر کوئی شے پیش کرنا مشکل کام ہے‘ لیکن دائیں بائیں سے حملہ آور ہونا اور اعتراض وارد کرنا آسان ہوتا ہے۔ کسی جگہ پر کوئی بھی تنقید کا پہلو نکال لینا بہت آسان ہے۔ جیسے وہ مشہور بات ہے کہ ایک مصور نے اپنے فن کی شاہکار تصویر کہیں لٹکا دی اور کہا کہ لوگ اس پر تنقید کریں تو سب کی زبانیں چلنے لگیں۔ کوئی اِس اعتبار سے تنقید کر رہا ہے تو کوئی اُس اعتبار سے‘ لیکن جب اُس نے کہا کہ بھئی یہ برش موجود ہے‘ جہاں نقص نظر آتا ہے اُسے درست کر دو! تو اب کسی نے اسے ہاتھ نہیں لگایا۔ اس لیے کہ اُس کا متبادل پیش کرنا تو آسان کام نہیں تھا۔

اسی اعتبار سے ایک اعتراض یہ کیا گیا کہ قرآن مجید میں بڑی حقیر چیزوں مثلاً مچھر‘ مکھی اور مکڑی کی مثالیں دی گئی ہیں۔ جیسے سورۃ العنکبوت میں فرمایا: ﴿وَ اِنَّ اَوْهَنَ الْبُيُوْتِ لَبَيْتُ الْعَنْكَبُوْتِ ۘ﴾ (آیت ۴۱) ’’اور یقیناً تمام گھروں میں سے کمزور ترین گھر مکڑی کا جالا ہے۔‘‘ یا جیسے سورۃ الحج میں مکھی کی مثال دی گئی:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَهٗ ؕ وَ اِنْ يَّسْلُبْهُمُ الذُّبَابُ شَيْـًٔا لَّا يَسْتَنْقِذُوْهُ مِنْهُ ؕ﴾ (آیت ۷۳)

’’اے لوگو! ایک مثال بیان کی جا رہی ہے‘ پس اسے ذرا توجہ سے سنو! یقیناً جن کو بھی تم پکارتے ہو اللہ کے سوا (تمہارے یہ معبود‘ یہ بُت) ایک مکھی پیدا کرنے پر بھی قادر نہیں ہیں اگرچہ وہ سب اس کے لیے جمع ہو جائیں۔ اور اگر مکھی ان سے کوئی چیز چھین کر لے جائے تو یہ اس سے وہ چیز چھڑانے کی ہمت بھی نہیں رکھتے۔‘‘

یہ ساری مثالیں اس اعتبار سے ہوتی ہیں کہ جو مضمون بیان کرنا مقصود ہے اس کے ساتھ مطابقت ہو۔ جس حقیقت کو ذہن کے قریب لانا ہے اُس کے لیے وہ تشبیہ اور تمثیل مؤثر اور مفید ہو اور ایک پورا نقشہ ذہن میں آ جائے۔ اس میں یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ مشبہ بہ یا ممثل بہ یعنی جس شے سے تشبیہ یا تمثیل دی جا رہی ہے وہ کیا ہے! جس چیز کو بیان کرنا ہے ویسی ہی تمثیل لائی جائے گی۔ اس اعتبار سے رسول اللہ ﷺ نے سود کے لیے جو تشبیہ دی ہے اس پر طبیعت ایک دفعہ تو بہت گھبراتی ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَلرِّبَا

سَبْعُونَ حُوبًا، أَيْسَرُهَا أَنْ يَنْكِحَ الرَّجُلُ أُمَّهُ)) [سنن ابن ماجه: ۲۲۷۴]
ان الفاظ کو انسان زبان سے ادا کرتے ہوئے بھی ہچکچاتا ہے کہ ''سود کے گناہ کے ستر حصے ہیں، جن میں سب سے ہلکا اس کے مساوی ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں کے ساتھ زنا کرے۔'' یہ تشبیہ طبیعت پر ناگوار گزرتی ہے۔ یا جیسے سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا کہ تمہارا غیبت کرنا بالکل ایسے ہے کہ گویا تم اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھا رہے ہو: ﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ ؕ﴾ (آیت ۱۲)۔ اس سے بھی انسان کی طبیعت میں جھرجھری سی آتی ہے۔ کیا کوئی تصور کرسکتا ہے کہ مُردہ بھائی کی لاش پڑی ہو اور کوئی شخص اسے کاٹ کاٹ کر تناول فرما رہا ہو! دراصل اس سے مقصود کسی شے کی شناعت اور قباحت کو ظاہر کرنا ہے کہ ایک چیز فطری طور پر تو تمہیں بہت بُری لگتی ہے لیکن اخلاقی سطح پر ایک دوسرا عمل جو اسی کے ہم وزن ہے، اتنا ہی برا ہے، اس سے تمہیں طبعی طور پر نفرت نہیں ہے! چنانچہ یہاں فرمایا کہ یقیناً اللہ تعالیٰ کو اس میں کوئی حیا محسوس نہیں ہوتی، کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی، اللہ اس سے نہیں شرماتا کہ بیان کرے کوئی مثال مچھر کی یا اُس چیز کی جو اس سے بڑھ کر ہے۔

یہاں ایک نکتہ نوٹ کر لیجیے کہ ''حیات'' اور ''حیا'' کا مادّہ ایک ہی ہے۔ یہ زندگی (حیات) جو ہے، اس کا گویا لازمی وصف حیا ہے۔ زندگی کا اصل زیور، اصل جوہر حیا ہے۔ حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں: ((إِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ)) [صحیح البخاری: ۶۱۲۰] ''جب تم میں شرم و حیا ہی نہ رہی تو جو جی چاہے کرتے پھرو!'' فارسی میں کہا جاتا ہے: ''بے حیا باش و ہر چہ خواہی کن!'' یعنی جب حیا کا پردہ اُٹھ گیا تو اب جو چاہو کرو۔ یہی تو ایک رکاوٹ ہے جو انسان کو برائی اور بدی سے روکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ چیز انسان کی فطرت کے اندر رکھی ہوئی ہے۔

یہاں فرمایا: ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖٓ﴾ اللہ کو اس سے کوئی حیا محسوس نہیں ہوتی، کوئی جھجک اور ہچکچاہٹ نہیں ہے، اللہ اس سے نہیں شرماتا ﴿اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا﴾ کہ وہ کوئی مثال بیان کرے۔ یہ ''مَا'' مَثَلًا کے ساتھ ہے، اس کو مَا ابہامیہ کہتے ہیں۔ مَثَلًا مَّا: کوئی سی بھی مثال۔ جیسے کہتے ہیں: اَعْطِنِی کِتَابًا مَا یعنی مجھے کوئی سی بھی کتاب

دے دو۔ کسی وقت آپ کو پڑھنے کے لیے کچھ چاہیے اور آپ کی کوئی خاص پسند نہیں ہے تو ''مَا'' کا لفظ آتا ہے' اس اعتبار سے کہ کوئی سی بھی ہو' مجھے کتاب چاہیے۔ مَا ابہامیہ آتا ہے تو نکرہ میں اور زیادہ عموم پیدا ہو جاتا ہے اور اس کے اندر کوئی بھی' کسی بھی طرح کا مفہوم پیدا ہو جاتا ہے۔ ارشاد ہوا کہ اللہ تعالیٰ کو تو اس سے کوئی حیا محسوس نہیں ہوتی کہ وہ کوئی مثال' کوئی تشبیہ' کوئی تمثیل بیان کرے (اردو میں مثال' تمثیل اور ضرب المثل مستعمل ہے)۔ ﴿بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا﴾: چاہے وہ مچھر ہی کی ہو یا اُس چیز کی جو اس سے بڑھ کر ہے۔ بَعُوْض اور بَعُوْضَة درحقیقت واحد کے لیے آتا ہے۔ بَعُوْضَةً: کوئی ایک مچھر۔ فَمَا فَوْقَهَا: فَوْقَ کا لفظ اوپر کے لیے آتا ہے' لیکن یہاں مراد ہے اس سے بھی حقیر شے۔ یعنی حقیر ہونے میں مچھر اور اُس سے کوئی کم تر شے۔

﴿فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ﴾ ''تو جو لوگ صاحبِ ایمان ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ یقیناً حق ہے اُن کے ربّ کی طرف سے۔''

اللہ تعالیٰ کا قانونِ ہدایت وضلالت: دوسرا رُخ

یہاں اصل میں اللہ تعالیٰ کے قانونِ ہدایت وضلالت کا ایک اور رُخ بیان ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے دو مرتبہ وہ آیات (آیت ۷ اور ۱۷' ۱۸) آچکی ہیں جن میں اس قانون کا ایک رُخ آچکا ہے کہ اگر کوئی شخص حقیقت اور حق سے گریز کرے' اعراض کرے' تو ہوتے ہوتے اُس کے اندر سے حق کو پہچاننے کی استعداد سلب ہو جاتی ہے' اور بالآخر اُس کے دل پر مہر ہو جاتی ہے۔ البتہ یاد رہے کہ یہ آخری نتیجہ ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ ابتدا ہی میں اللہ تعالیٰ مہر کر دیتا ہے کہ جس کی وجہ سے انسان حق کو نہیں پہچان پاتا' بلکہ حق کو پہچاننے کے باوجود اُس کو نہ ماننا وہ جرم ہے جس کی سزا اس دنیا میں یہ ملتی ہے کہ حق کو پہچاننے کی صلاحیت ہی سلب ہو جاتی ہے۔ چنانچہ آیت ۷ میں ارشاد ہوا: ﴿خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝﴾ ''اللہ نے مہر کر دی ہے اُن کے دلوں پر اور اُن کے کانوں پر' اور ان کی آنکھوں کے سامنے پردہ پڑ چکا ہے' اور ان کے لیے بہت بڑا عذاب ہے۔'' یہی بات آیات ۱۷ اور ۱۸

میں بیان کردہ تمثیل کے اندر آئی ہے اور اس کے آخر میں فرمایا: ﴿صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾ ''یہ بہرے ہیں' گونگے ہیں' اندھے ہیں' سو اب یہ نہیں لوٹیں گے۔''

ان دونوں مقامات پر قانونِ ہدایت و ضلالت کا آخری نتیجہ بیان کیا گیا ہے۔ زیر مطالعہ آیت میں یہ وضاحت ہے کہ اصل میں ہدایت اور ضلالت کا دارومدار انسان کی اپنی نیت اور طلب پر ہے۔ اگر اُس کی طلب نیک ہے' صادق ہے' وہ حق کا جویا' حق کا متلاشی اور اس کا طالب ہے' تو اللہ تعالیٰ اس کو لازماً ہدایت دے گا' راستہ کھولے گا' حقیقت واشگاف کر دے گا' حق کو مبرہن کر دے گا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا پختہ وعدہ ہے۔ البتہ اگر اپنے دل میں کجی ہے' زیغ ہے' ٹیڑھ ہے' نیت کا فساد ہے یا پھر تعصب' تکبر' حسد ہے تو پھر چاہے کتنے ہی علم و معرفت کے موتی بکھیر دیے جائیں' کتنے ہی دلائل دے دیے جائیں' کتنی ہی آنکھیں کھول دینے والی دلیلیں دے دی جائیں' استشہاد کر لیا جائے' قطعاً مفید نہیں ہوگا' بلکہ اُس کی ہٹ دھرمی' ضد اور تعصب' جس کو ''شِقَاق'' کہا گیا ہے' بڑھتا ہی چلا جائے گا۔ چنانچہ یہی بات سورۃ الیل میں آئی ہے: ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى ﴿۷﴾﴾ ''تو اُس کو ہم رفتہ رفتہ آخری آسانی تک پہنچا دیں گے۔'' اور اسی طرح ﴿فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى ﴿۱۰﴾﴾ ''تو اُس کو ہم رفتہ رفتہ آخری تنگی تک پہنچا دیں گے۔'' یہ دراصل تیسیر (آسانی) ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے' لیکن اس تیسیر کی حیثیت ثانوی ہے۔ اصل شے انسان کی طلب اور اُس کی اپنی نیت ہے۔ اگر کوئی ہدایت کا طالب ہے تو اللہ کا وعدہ ہے: ﴿وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ﴾ (العنکبوت:۶۹) ''اور جو لوگ ہماری راہ میں جِدّوجُہد کریں گے ہم لازماً اُن کی راہنمائی کریں گے اپنے راستوں کی طرف۔'' یہ ہمارا پختہ وعدہ ہے کہ اگر تم حق کے جویا اور متلاشی ہو تو حق تمہیں ملے گا۔ لیکن اگر تمہارے اندر تعصب ہے' کجی ہے' تو پھر سورۃ الصّف میں بیان کردہ یہود کا یہ حال دیکھ لو: ﴿فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۵﴾﴾ ''پھر جب وہ ٹیڑھے ہو گئے تو اللہ نے اُن کے دلوں کو بھی ٹیڑھا کر دیا۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے فاسقوں کو زبردستی ہدایت نہیں دیتا۔'' اس لیے کہ یہ دنیا اور اس کی زندگی تو درحقیقت ایک

امتحانی وقفہ ہے۔ امتحان میں جب تک انسان کا آزادانہ انتخاب (free choice) نہ ہو تو امتحان بے معنی ہے۔ اللہ تعالیٰ جبراً انسان کو ہدایت دے دے تو اس میں اس کا کوئی کریڈٹ نہیں ہے۔ پھر اجر و ثواب کس بات کا؟ اسی طریقے سے جبراً کسی کو گمراہ کر دے تو اس پر کوئی ملامت نہیں، اس پر کوئی الزام نہیں، اسے کوئی سزا نہیں ملنی چاہیے۔ چنانچہ فلسفہ حیات کے حوالے سے انسان کو آزادانہ انتخاب دیا گیا ہے، جس کے اعتبار سے ہدایت یا گمراہی کے راستے کھلتے چلے جائیں گے۔

قرآن حکیم میں کبھی کبھی فعل، ارادۂ فعل کے معنی میں بھی آتا ہے۔ چنانچہ یہاں ﴿فَاَمَّا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا﴾ ''جو لوگ ایمان والے ہیں'' کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے: وہ لوگ جو ایمان لائے، یا ایمان لانا چاہتے ہیں، یا وہ لوگ جو ایمان کے طالب اور جویا ہیں، جو حقیقت کے متلاشی ہیں، جو ارادہ رکھتے ہیں ایمان کا۔ ﴿فَیَعۡلَمُوۡنَ اَنَّهُ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۚ﴾ ''تو وہ جان لیتے ہیں کہ یہ یقیناً حق ہے اُن کے رب کی طرف سے۔'' اُنہیں انشراح و انبساط ہوتا ہے، اُن کا دل مطمئن ہوتا ہے، دل میں کوئی دغدغہ (ڈر، تشویش اور خدشہ) یا کوئی شک و شبہ نہیں رہتا۔ وہ پورے انشراح کے ساتھ جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے۔ واقعتاً جس طریقے سے یہ حقیقت اس تشبیہ کے ذریعے مبرہن، منکشف اور واضح ہوئی ہے، ہم کسی اور طریقے سے شاید اس بات کو اتنی خوبصورتی سے اس طرح سمجھ نہ پاتے۔

﴿وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا فَیَقُوۡلُوۡنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ﴾ ''اور جنہوں نے کفر کیا سو وہ کہتے ہیں: کیا مطلب تھا اللہ کا اس مثال سے؟''

''اَمَّا'' کا ترجمہ ہوتا ہے as for them یعنی جن کا یہ معاملہ ہے اُن کے ساتھ یہ ہوگا۔ ﴿وَ اَمَّا الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا﴾ ''اور وہ لوگ جو کفر کریں'' یا کفر کرنا چاہیں۔ یہاں لفظِ کفر کا دوسرا مفہوم ''ناشکری'' بھی بڑی عمدگی سے منطبق ہوتا ہے۔ ایک تو وہ لوگ ہیں جو اپنے ربّ کی طرف سے آنے والی ہر بات کا شکر ادا کرتے ہیں، اس کی قدر دانی کرتے ہیں، اور ایک وہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو سمجھانے کے لیے، افہام و تفہیم کے لیے تمثیل و تشبیہ بیان کی اور وہ ناقدری کر رہے ہیں: ﴿فَیَقُوۡلُوۡنَ مَاذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ﴾

''تو وہ کہتے ہیں کہ کیا ارادہ کیا ہے اللہ تعالیٰ نے اس مثال سے؟'' یہ بڑا استحقار اور استنکار کا انداز ہے۔ استنکار اور انکار دونوں کا مفہوم ایک ہی ہوگا۔ یعنی یہ کیا ہے! یہ تو کوئی بہت اعلیٰ مثال نہیں ہے۔ اگر واقعی یہ اللہ کا کلام ہوتا تو اس سے بہتر تمثیل ہو سکتی تھی' کوئی بہتر پیرایۂ بیان اختیار کیا جا سکتا تھا۔ اب یہ ایک ہی شے کے دو رویے ہیں' دو ردِّعمل ہیں' دو نتیجے ہیں۔ معلوم ہوا کہ فیصلہ کن شے انسان کی اپنی داخلی کیفیت ہے۔ اُسی تشبیہ' اُسی تمثیل' اُنہی آیاتِ مبارکہ پر ایک ردِّعمل یہ ہے کہ یہ یقیناً حق ہے ہمارے ربّ کی طرف سے۔ اُن کے ایمان میں اضافہ ہو رہا ہے' اُنہیں انشراح اور انبساط ہو رہا ہے۔ دوسری طرف ایسے لوگ ہیں کہ وہی چیز ان کے اندر انکار' استنکار اور استحقار کی کیفیت پیدا کر رہی ہے۔ فرمایا:

﴿يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ﴾ ''اللہ گمراہ کرتا ہے اسی کے ذریعہ سے بہت سوں کو' اور ہدایت دیتا ہے اسی کے ذریعہ سے بہت سوں کو۔''

یہ ہیں اب فیصلہ کن' کانٹے کے الفاظ۔ یہ مضمون سورۃ المدثّر میں بھی آیا ہے جو ابتدائی مکی سورتوں میں سے ہے۔ لہٰذا نوٹ کر لیجیے کہ ایک ہی چیز ہے لیکن اصل میں انسان کی اپنی داخلی کیفیت کے اعتبار سے نتیجے مختلف ظاہر ہو رہے ہیں۔ البتہ:

﴿وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۶﴾ ''اور نہیں گمراہ کرتا وہ اس کے ذریعے سے مگر صرف سرکش لوگوں کو۔''

''فسق'' کا مفہوم

یہاں پر ہدایت دینے والے معاملے کی تفصیل بیان نہیں کی گئی۔ اب اس پر اشکال ہو سکتا ہے کہ یُضِلُّ میں ضمیر فاعلی تو اللہ کی طرف ہے کہ اللہ گمراہ کر رہا ہے۔ اگرچہ یہ بیان ہو چکا ہے کہ ان کی گمراہی کا اصل سبب اُن کی اپنی داخلی کیفیت اور اُن کے اپنے ذہن کی کجی اور ٹیڑھ ہے' لیکن یہ قانونِ خداوندی ہے کہ جو کوئی جس راستے کی طرف جانا چاہتا ہے وہی راستہ اُس کے لیے کھول دیا جاتا ہے۔ جو چیز قانونِ طبیعت اور قانونِ فطرت کے تحت ظہور پذیر ہو رہی ہو اُسے اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ قانونِ قدرت کا جو

نتیجہ ہے وہ گویا اللہ کا فعل ہے۔ ﴿وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝۲۶﴾ لیکن اچھی طرح جان لو کہ اللہ تعالیٰ نہیں گمراہ کرتا مگر فاسقوں کو۔

یہ فسق کیا ہے؟ اس کا اصل مفہوم ہے کسی شے کا کسی دوسری شے سے نکل جانا' کسی برائی یا کمی کے ساتھ۔ اسی لیے فَسَقَ کے ساتھ حرفِ جار ''عَنْ'' آتا ہے۔ سورۃ الکہف میں ابلیس کے بارے میں آیا ہے: ﴿كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۭ﴾ (آیت ۵۰) ''وہ جِنّات میں سے تھا پس وہ نکل بھاگا اپنے ربّ کے حکم سے۔'' فرشتوں کو حکم دیا گیا تھا کہ سب کے سب حضرت آدمؑ کو سجدہ کرو' سب نے سجدہ کیا' سوائے ابلیس کے۔ وہ فرشتوں میں سے نہیں تھا۔ فرشتہ ہوتا تو کبھی بھی اللہ تعالیٰ کے حکم سے سرتابی نہ کرتا۔ چونکہ وہ جِنّات میں سے تھا' پس وہ نکل بھاگا اپنے ربّ کے حکم سے۔ چنانچہ کسی شے سے نکل جانا' حد سے تجاوز کر جانا ''فسق'' ہے۔ لفظ ''فسق'' کا اس معنی میں بہت broad spectrum ہے۔ اللہ تعالیٰ کا معمولی اور چھوٹا سا حکم توڑا جائے تو یہ بھی فسق ہے۔ اگر اللہ کے مدِ مقابل ضِد اور ند بن کر کھڑے ہو گئے' بغاوت اور سرکشی پر آمادہ ہو گئے تو یہ بھی فسق ہے۔ معلوم ہوا کہ لغوی مفہوم کے اعتبار سے چھوٹے چھوٹے گناہوں سے اللہ کے مقابلے میں سرکشی اور بغاوت تک سب پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ البتہ اس مقام پر خود قرآن حکیم کے الفاظ میں ''فسق'' کی تشریح ملاحظہ کیجیے:

آیت ۲۷ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝۲۷ ''جو توڑ دیتے ہیں اللہ کے (ساتھ کیے ہوئے) عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد' اور کاٹتے ہیں اُس چیز کو جسے اللہ نے جوڑنے کا حکم دیا ہے اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔ یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔''

دین وشریعت کی دو بنیادیں

یہ گویا عمرانیاتِ قرآنی کا بہت اہم مضمون ہے۔ اصل میں شریعت اور دین کی دو بنیادیں حقوق اللہ اور حقوق العباد ہیں۔ انسان کی یہی دو نسبتیں صحیح ہونی چاہئیں۔ اس

آیت میں ''فاسقین'' کے بارے میں بتایا جارہا ہے کہ وہ نہ تو حقوق اللہ کا خیال کرتے ہیں اور نہ ہی انہیں حقوق العباد کا کوئی پاس ولحاظ ہوتا ہے۔

نَقَضَ یَنْقُضُ نَقْضًا کے معنی ہیں: توڑ دینا۔ ''نواقض وضو'' وہ چیزیں کہلاتی ہیں جن سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ نقص اور نقض میں تھوڑا سا فرق ہے۔ نَقَصَ کے معنی کمی ہوجانا یا کمی کر دینا' اور نَقَضَ کے معنی کسی شے کو توڑ دینا کے ہیں۔ ایک ہے محض کمی' کوتاہی' اور ایک ہے کسی شے کا سلسلہ منقطع کر دینا۔ ﴿اَلَّذِیْنَ یَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِیْثَاقِهٖ﴾ ''وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں اُس کے پختہ ہونے کے بعد۔'' میثاق مصدر ہے ''وث ق'' مادّہ سے۔ اسی سے لفظ وثوق بنا ہے۔ کہا جاتا ہے مَیں بڑے وثوق کے ساتھ کہہ رہا ہوں' یعنی مجھے یقین ہے' پختہ اعتماد ہے۔ مَوثِقًا: وہ قسم جو بڑے شعور کے ساتھ کھائی گئی ہو۔ سورۂ یوسف میں ''مَوْثِقًا مِّنَ اللّٰهِ'' کے الفاظ آئے ہیں۔ شریعت کو بھی میثاق کہا گیا ہے' سورۃ المائدہ میں ارشاد ہوا:

﴿وَ اذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَ مِیْثَاقَهُ الَّذِیْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا ۫﴾ (آیت ۷)

''اور اللہ نے تمہیں جو اپنی نعمت عطا کی ہے اس کو یاد رکھو' اور اُس معاہدے کو بھی جس میں اُس نے تمہیں باندھ لیا ہے جب تم نے کہا تھا: ہم نے سنا اور اطاعت قبول کی۔''

''اللہ کا عہد'' کیا ہے؟

یہ سب میثاق ہیں' لیکن آیت زیرِ مطالعہ میں کون سا میثاق مذکور ہے؟ واضح رہے کہ قرآن کریم میں اہم مضامین دو مرتبہ ضرور آتے ہیں۔ سورۃ الرعد جو مکی سورت ہے اُس میں بھی یہ مضمون آیا ہے: ﴿الَّذِیْنَ یُوْفُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَ لَا یَنْقُضُوْنَ الْمِیْثَاقَ ۝۲۰﴾ ''وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو پورا کرتے ہیں اور میثاق کو توڑتے نہیں ہیں۔'' یہاں مقامِ مدح میں اچھے لوگوں کا ذکر کیا جارہا ہے کہ جو حق پر ہیں۔ اگلی آیت میں ان کے بارے میں فرمایا: ﴿وَ الَّذِیْنَ یَصِلُوْنَ مَاۤ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ وَ یَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ وَ یَخَافُوْنَ

سُوۡٓءَ الۡحِسَابِ﴿۲۱﴾ ’’اور جو لوگ جوڑتے ہیں اُس کو جس کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے‘ اور جوڑ رتے رہتے ہیں اپنے ربّ سے اور اندیشہ رکھتے ہیں بُرے حساب کا۔‘‘ یعنی محاسبۂ آخرت کا جو برا نتیجہ نکل سکتا ہے اُس سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔

اب یہاں غور کیجیے کہ اس میثاق سے کیا مراد ہے۔ ویسے تو میثاق کا لفظ قرآن کریم میں مختلف معنی میں آیا ہے لیکن اگر اس کی صحیح ترین تعبیر تلاش کی جائے تو سورۃ الاعراف میں تذکرہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ازل میں پوری نوعِ انسانی سے ایک عہد لیا تھا:

﴿وَاِذۡ اَخَذَ رَبُّكَ مِنۡۢ بَنِىۡۤ اٰدَمَ مِنۡ ظُهُوۡرِهِمۡ ذُرِّيَّتَهُمۡ وَاَشۡهَدَهُمۡ عَلٰٓى اَنۡفُسِهِمۡ ۚ اَلَسۡتُ بِرَبِّكُمۡ ؕ قَالُوۡا بَلٰى ۛۚ شَهِدۡنَا ۛۚ﴾ (آیت ۱۷۲)

’’اور یاد کرو جب نکالا آپؑ کے رب نے تمام بنی آدم کی پیٹھوں سے اُن کی نسل کو اور اُن کو گواہ بنایا خود اُن کے اوپر‘ (اور سوال کیا:) کیا مَیں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: کیوں نہیں! ہم اِس پر گواہ ہیں۔‘‘

ترتیبِ مصحف کے اعتبار سے ہمارے ذہن میں یہ نقشہ رہتا ہے کہ یہ بات تو ابھی بیان نہیں ہوئی اور یہاں اس کا اجمالی اشارہ آیا ہے۔ دل میں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ یہاں تو بات وضاحت سے آنا چاہیے تھی‘ بعد میں چاہے کوئی اجمالی اشارہ ہو جاتا‘ لیکن ذہن میں رکھیے کہ ترتیبِ نزولی کے اعتبار سے یہ مضمون قرآن حکیم میں پہلے ہی تفصیل کے ساتھ آچکا ہے‘ اس لیے کہ سورۃ الاعراف مکی سورت ہے۔ یہ ہے عہدِ الست جس کی طرف یہاں بایں الفاظ اشارہ کیا جا رہا ہے: ﴿الَّذِيۡنَ يَنۡقُضُوۡنَ عَهۡدَ اللّٰهِ مِنۡۢ بَعۡدِ مِيۡثَاقِهٖ﴾۔ اب اس کے خلاف جو بھی طرزِ عمل ہوگا گویا وہ نقضِ عہد ہے‘ اللہ کے ساتھ کیے گئے عہد کو توڑنا ہے۔

یہ عہد ہم سے اُس وقت لیا گیا تھا جب ہم عالمِ ارواح میں تھے۔ ابھی عالمِ خلق میں ہمارا وجود نہیں تھا۔ ابھی اَجسادِ انسانی کی تخلیق نہیں ہوئی تھی۔ کُل کی کُل انسانی اَرواح موجود تھیں جن سے یہ عہد لیا گیا۔ اس کے بارے میں حدیث میں آتا ہے: ((اَلْاَرْوَاحُ جُنُودٌ مُجَنَّدَةٌ)) [صحیح مسلم: ۶۷۰۸] یعنی ارواحِ انسانی کے لشکروں کے لشکر

تھے اور وہ سب بیک وقت موجود تھیں۔ اِس وقت تو ہمارے درمیان ترتیبِ زمانی ہے: مَیں، مجھ سے پہلے میرے والد، اُن سے پہلے میرے دادا، اُن سے پہلے پردادا۔ اُس وقت سب کے سب موجود تھے۔ ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام سے آخری انسان جو قیامت تک پیدا ہوگا اُن سب کی ارواح وہاں موجود تھیں اور اُن سے یہ عہد لیا گیا تھا۔ درحقیقت اسی عہدِ الست یا میثاقِ الست کی طرف یہاں اشارہ ہے۔ گزشتہ آیات میں جو توحید کی دعوت دی گئی: ﴿اعْبُدُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ﴾ اُس کے حوالے سے گویا تاکید ہے کہ نقضِ عہد نہ ہو، نقضِ میثاق نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کیے گئے عہد کا ایفاء اور اُس کی پابندی، یہ گویا اسلامی تمدن، اسلامی نظام اور اَعمال واَخلاق کی پہلی جڑ اور بنیاد ہے۔

رحمی رشتوں کی اہمیت

﴿وَ یَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖۤ اَنْ یُّوْصَلَ﴾ ''اور وہ کاٹتے ہیں اُس کو، جس کو جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔'' یہ الفاظ بھی اگرچہ عام ہیں اور انسان اپنی ذہنی اُپج اور ذوق کے مطابق اس خاکہ میں رنگ بھر سکتا ہے، لیکن قرآن کریم کے نظائر کو سامنے رکھا جائے تو اس سے مراد ہے رحمی رشتہ۔ انسان کی دو نسبتیں ہیں اور یہ دونوں اگر صحیح ہوں تو اُس کا انفرادی رویہ بھی درست ہوگا اور اس کے نتیجہ میں جو تمدن وجود میں آئے گا وہ بھی صحیح ہوگا۔ ایک نسبت اللہ کے ساتھ ہے، جو نسبتِ عبدیت ہے۔ دوسری نسبت انسانوں کے ساتھ ہے، جن میں سب سے قریبی رحمی رشتہ ہے۔ رحمی رشتہ کے حوالے سے پوری نوعِ انسانی درجہ بدرجہ ایک وحدت بن جائے گی۔ ایک ماں باپ کی اولاد ہے تو قریب ترین رحمی رشتہ میں منسلک ہیں۔ ذرا ایک پیڑھی اوپر چڑھ جائیں تو دادا اور دادی کی اولاد میں وہ حلقہ وسیع ہو جاتا ہے۔ پردادا اور پردادی کی اولاد میں وہ حلقہ مزید وسیع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ آدم وحوا پر جا کر پوری نوعِ انسانی اس میں آجائے گی۔ البتہ اس میں ''الأقرب فالأقرب'' کا اعتبار کیا جائے گا۔ یعنی جو جتنا قریب ہے، صلہ رحمی میں اس کا حق اتنا ہی زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ النساء کی پہلی آیت میں فرمایا:

﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ

مِنۡهَا زَوۡجَهَا وَبَثَّ مِنۡهُمَا رِجَالًا كَثِيۡرًا وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِىۡ تَسَآءَلُوۡنَ بِهٖ وَالۡاَرۡحَامَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيۡكُمۡ رَقِيۡبًا ①﴾

''اے لوگو! اپنے اُس رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی سے اس کا جوڑا بنایا' اور ان دونوں سے پھیلا دیے (زمین میں) کثیر تعداد میں مرد اور عورتیں۔ اور تقویٰ اختیار کرو اُس اللہ کا جس کا تم ایک دوسرے کو واسطہ دیتے ہو' اور رحمی رشتوں کو توڑنے سے بھی بچو! یقیناً اللہ تعالیٰ تم پر نگران ہے۔''

تقویٰ اختیار کرو اُس اللہ کا جس کا تم ایک دوسرے کو واسطہ دیتے ہو۔ ایک دوسرے سے مانگتے ہو' اپیل کرتے ہو تو اُس کے نام پر کرتے ہو' اور رحمی رشتوں کا لحاظ رکھو' صلہ رحمی کرو۔ قطع رحمی نہ کرو۔ رحمی رشتوں کو کاٹو نہیں' جوڑو! یہ ہے درحقیقت تمدن کی اصل بنیاد۔ جہاں یہ جذبہ ہوگا' انسان صحیح طور پر رحمی رشتوں کے حقوق ادا کرے گا تو وہاں درجہ بدرجہ یہ بات پھیلتی چلی جائے گی اور وسیع سے وسیع تر دائرے بنتے جائیں گے' اور بالآخر پوری نوعِ انسانی ایک دائرے میں سما جائے گی۔ اس ضمن میں سورۃ الحجرات میں ارشاد ہوا:

﴿يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقۡنٰكُمۡ مِّنۡ ذَكَرٍ وَّاُنۡثٰى وَجَعَلۡنٰكُمۡ شُعُوۡبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوۡا ؕ اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰىكُمۡ ؕ﴾ (آیت ۱۳)

''اے لوگو! ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے ایک مرد اور ایک عورت سے' اور ہم نے تمہیں مختلف قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے' تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ یقیناً تم میں سب سے زیادہ باعزّت اللہ کے ہاں وہ ہے جو تم میں سب سے بڑھ کر متقی ہے۔''

اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ شریعتِ اسلامی کے بھی دو حصے ہیں: حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ یہی وجہ ہے کہ عبادات میں بھی چوٹی کی جو عبادتیں ہیں' نماز اور زکوٰۃ' ان میں سے ایک حقوق اللہ اور دوسری حقوق العباد سے متعلق ہے۔ ویسے تو روزہ ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے' زکوٰۃ ہر ایک پر فرض نہیں ہے۔ جو بھی صاحبِ استطاعت ہوگا' صاحبِ نصاب ہوگا زکوٰۃ اُسی پر فرض ہوگی' لیکن عبادات میں ہمیشہ دوستون جوگاڑے

جاتے ہیں وہ نماز اور زکوٰۃ ہیں ﴿وَاَقِیۡمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ﴾۔ نماز اللہ سے جوڑنے والی اور زکوٰۃ بندوں سے جوڑنے والی ہے۔ تمہارے بنی نوع میں سے جو بھی پیچھے رہ گئے ہیں ان کو بھی تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ یہ تمہیں جوڑنے والی شے ہے اپنے ابنائے نوع کے ساتھ' اور نماز تمہیں جوڑنے والی شے ہے اپنے ربّ کے ساتھ۔ گویا یہ دو چیزیں جو یہاں آئی ہیں انہی کے حوالے سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی رعایت کرو۔

اللہ تعالیٰ کے ساتھ ''عہدِ الست'' کے علاوہ پھر اضافی عہد بھی ہیں۔ جب کوئی شخص ایمان لے آتا ہے تو وہ گویا اسی عہد کی توثیق کرتا ہے۔ جب کسی قوم کو شریعت عطا ہوتی ہے تو اس سے گویا ایک مزید پختہ اور گہرا میثاق لیا جاتا ہے۔ پھر جب وہ کہہ دیتی ہے: ''سَمِعۡنَا وَ اَطَعۡنَا'' تو اس میثاق میں مزید جکڑی جاتی ہے۔ فرمایا کہ جو فاسق لوگ یہ دو حرکتیں (اللہ کے ساتھ کیے ہوئے عہد کو توڑنا اور قطع رحمی) کرتے ہیں اللہ تعالیٰ صرف اُن کو گمراہ کرتا ہے۔

﴿وَ یُفۡسِدُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ ؕ﴾ ''اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔''

نقضِ عہد اور قطع رحمی کا نتیجہ

مذکورہ بالا دو حرکتوں کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ زمین میں فساد پھیل جاتا ہے۔ پہلا نتیجہ اللہ تعالیٰ کے خلاف بغاوت کی صورت میں نکلے گا' اور دوسرا یہ کہ خلق کے ساتھ انسان کا تعلق صحیح نہیں رہے گا۔ وہ حقوق العباد ادا نہیں کرے گا' نہ پڑوسی کے' نہ قرابت داروں کے' نہ والدین کے۔ یہ فسق و فجور جن کے اندر ہے' جو ان دو جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں' یہی لوگ مفسد ہیں۔ قرآن کریم سے بھی انہیں ہدایت کے بجائے گمراہی ملے گی۔ جو کلام ''ھُدًی لِّلنَّاس'' بن کر آیا ہے' نوعِ انسان کی ہدایت کی ضرورت کو پورا کرنے والا ہے' انہیں اس سے ہدایت نہیں ملے گی' بلکہ اپنے اندر کی اس داخلی کجی کی وجہ سے اس قرآن مجید سے بھی انہیں گمراہی ملے گی۔

﴿اُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡخٰسِرُوۡنَ ﴿۲۷﴾﴾ ''یہی لوگ نقصان اٹھانے والے ہیں۔''

وہی ہوں گے ابدی خسارہ اٹھانے والے۔ گھاٹے میں وہی رہیں گے' برباد وہی

ہوں گے۔ خسارے کا لفظ ہم اپنی زبان میں بکثرت استعمال کرتے ہیں۔ دو چار سو کے نقصان کے لیے بھی‘ دو چار ہزار کے لیے بھی اور دو چار لاکھ کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے‘ لیکن قرآن مجید میں لفظ ’’خسارہ‘‘ بہت بڑے اور ابدی نقصان کے لیے آتا ہے۔ درحقیقت فوز‘ فلاح اور رُشد‘ ان سب کے مقابلے میں یہی ایک جامع لفظ آتا ہے ’’خسارہ‘‘۔ فائزون‘ راشدون‘ مفلحون‘ یہ مختلف درجات تو ہیں فوز کے‘ کامیابی کے‘ انسان کے بامراد ہونے کے۔ منزلِ مقصود تک پہنچ جانے کے لیے یہ مختلف تعبیرات ہیں‘ لیکن ان سب کی ضد ایک ہی ہے اور وہ خسارہ ہے۔

آیت ۲۸ ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ﴿۲۸﴾﴾ ’’تم کیسے کفر کرتے ہو اللہ کا حالانکہ تم مُردہ تھے‘ پھر اُس نے تمہیں زندہ کیا۔ پھر وہ تمہیں مارے گا‘ پھر جِلائے گا‘ پھر تم اُسی کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے۔‘‘

حیاتِ انسانی اور اس کے مختلف اَدوار

یہ ہے وہ آیت جس کے بارے میں مَیں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ فلسفۂ قرآنی کے اس موضوع پر اُس نے مجھے بہت زیادہ انشراح عطا فرمایا ہے۔ اس آیت میں زندگی کی حقیقت بیان ہوئی ہے۔ فلسفۂ زندگی کے اعتبار سے علامہ اقبال کا یہ شعر بہت ہی اہم ہے ؎

تُو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں‘ پیہم دواں‘ ہر دم جواں ہے زندگی!

کہا جا سکتا ہے کہ اس آیتِ مبارکہ میں کسی درجے ابہام ہے‘ لیکن اَلْقُرْآنُ يُفَسِّرُ بَعْضُهُ بَعْضًا (قرآن کا ایک حصہ دوسرے حصے کی وضاحت کر دیتا ہے) کے اصول کے تحت اگر نظائر کے حوالے سے سمجھا جائے تو بات دو اور دو چار کی طرح بالکل واضح ہو جائے گی۔ فرمایا: ﴿كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾ ’’تم کیسے کفر کرتے ہو اللہ کا!‘‘ میرے نزدیک

یہاں کفر کا وہ مفہوم زیادہ صحیح منطبق ہوگا کہ کیسے ناشکری کرتے ہو اللہ کی! اللہ تعالیٰ نے تم پر جو احسانات کیے ہیں‘ اللہ کا جو تم پر فضل و کرم ہوا ہے اُس کا تم تصور کرو۔ یہ گویا تعجب کا ایک انداز ہے کہ جس پر اتنے فضل ہوئے ہوں‘ اس درجے کا کرم ہوا ہو‘ اللہ تعالیٰ کی اتنی عنایت رہی ہو وہ کفر کرے‘ کفرانِ نعمت کرے‘ ناشکری کرے! ﴿وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ﴾ ’’حالانکہ تم مردہ تھے‘ پھر اُس نے تمہیں زندہ کیا‘‘ ﴿ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ﴾ ’’پھر وہ تم پر موت وارد کرے گا‘‘ ﴿ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ﴾ ’’پھر وہ تمہیں زندہ کردے گا‘‘ ﴿ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۲۸﴾ ’’پھر تم اُسی کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے۔‘‘

ان الفاظ میں حیاتِ انسانی کے چار اَدوار کا ذکر آ گیا ہے‘ اس لیے کہ موت بھی درحقیقت معدوم ہونے کے معنی میں نہیں ہے۔ جب ہم کہتے ہیں کہ یہ شے مُردہ ہے تو وہ شے معدوم نہیں ہوتی۔ اُس کا وجود ہوتا ہے‘ صرف اس میں حیات کے آثار نہیں ہوتے‘ حیات کی صفات نہیں ہوتیں‘ حیات کی کیفیات نہیں ہوتیں۔ مُردہ معدوم تو نہیں ہوتا‘ اس کی لاش تو پڑی ہے۔ البتہ اُس میں زندگی نہیں ہے۔ صرف اس درجہ کا فرق ہے۔ یہ نہیں کہا گیا کہ ’’كُنتُم مَعدُومًا فخَلَقَكُمْ‘‘ کہ تم معدوم تھے پھر تمہیں پیدا کیا‘ بلکہ فرمایا: ﴿وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ﴾۔ یہی وجہ ہے کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے موت کو نیند سے بڑی خوبصورت تشبیہ دی ہے۔ رات کو سونے اور صبح کو اُٹھنے کی مسنون دعاؤں کے الفاظ پر غور کریں۔ سونے کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ قبلہ رُخ ہو کر‘ دائیں کروٹ لیٹ کر‘ داہنے ہاتھ پر اپنا دایاں گال رکھ کر پڑھیں: ((اَللّٰهُمَّ بِاسْمِكَ اَمُوتُ وَاَحْيَا)) ’’اے اللہ! تیرے ہی نام سے مَیں مرتا ہوں اور تیرے ہی نام سے مَیں زندہ ہوں گا۔‘‘ اسی طرح صبح آنکھ کھلے تو پڑھیں: ((اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِي أَحْيَانَا بَعْدَ مَا أَمَاتَنَا وَإِلَيْهِ النُّشُورُ)) ’’کُل شکر‘ کُل حمد‘ کُل ثنا اُس اللہ کے لیے ہے جس نے مجھے زندہ کر دیا اس کے بعد کہ مجھ پر موت وارد کر دی تھی‘ اور اُسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔‘‘ [صحیح البخاری‘ کتاب الدعوات] یعنی جیسے تم رات کو روزانہ سوتے ہو ایسے ہی ایک روز موت کی نیند سو جاؤ گے۔ جیسے روزانہ صبح کو بیدار ہوتے ہو ایسے ہی ایک وقت آئے گا کہ صبح قیامت تم بیدار ہو جاؤ

گے۔ بالفاظِ قرآنی: ﴿فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ ۝۶۸﴾ (الزمر) ''تو اچانک وہ کھڑے ہو جائیں گے دیکھتے ہوئے۔'' معلوم ہوا کہ موت اور نیند ایک دوسرے سے بہت مشابہ اور قریب ہیں' اس لیے کہ نیند میں بھی دراصل شعور چلا جاتا ہے اور موت میں جان بھی نکل جاتی ہے اور شعور بھی۔ انسان کی اصل حقیقت تو اس کا شعور ہے۔ نیند میں جان تو رہ گئی لیکن شعور سلب کر لیا گیا' البتہ جب موت آئی تو شعور کے ساتھ جان بھی سلب کر لی گئی' جب کہ جسم تو پڑا ہوا ہے' وہ دومَن کی لاش تو موجود ہے۔

زیرِ مطالعہ آیت میں چار اَدوار کا ذکر ہے: ﴿كُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ ۚ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ﴾ ''تم مُردہ تھے تو تمہیں زندہ کیا' پھر تم پر موت وارد کرے گا' پھر تمہیں زندہ کرے گا۔'' یہاں پر منطقی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پہلی موت کا جو ذکر کیا گیا ہے اس سے پہلے یقیناً کوئی زندگی ہونی چاہیے' اس لیے کہ موت تو زندگی کے بعد ہی آتی ہے۔ اس کو عدم محض تو نہیں کہا جا سکتا۔ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے کوئی شے زندہ تھی تو وہ مُردہ ہوئی ہے۔ کوئی ہستی تھی' کوئی حیات تھی کہ جس پر ''إماتہ'' کا عمل ہوا ہے۔ اس مضمون کے اعتبار سے سورۃ المؤمن کی دو آیات بہت ہی اہم ہیں۔ یہ اہلِ جہنم کا تذکرہ ہو رہا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ اِذْ تُدْعَوْنَ اِلَى الْاِيْمَانِ فَتَكْفُرُوْنَ ۝۱۰﴾

''جن لوگوں نے کفر کیا تھا انہیں پکارا جائے گا کہ آج تم جس قدر اپنی جانوں سے بے زار ہو گئے ہو' اللہ کی بیزاری تم سے اس سے کہیں بڑھ کر تھی جب تمہیں ایمان کی دعوت دی جاتی تھی اور تم کفر کرتے تھے۔''

﴿قَالُوْا رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝۱۱﴾

''وہ فریاد کریں گے: اے ہمارے رب! تُو نے ہمیں دو دفعہ مارا اور دو دفعہ زندہ کیا' تو اَب ہم نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے' تو کیا اب یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی راہ ہے؟''

اہلِ جہنم پر جو بیت رہی ہوگی اس کے نتیجے میں وہ اپنی جانوں سے بیزار ہو کر موت کو پکار رہے ہوں گے کہ کسی طریقے سے موت آئے اور ہمارا خاتمہ ہو جائے‘ ہمیں اس مصیبت سے چھٹکارا مل جائے۔ انہیں کہا جائے گا کہ جب تمہیں ایمان کی دعوت دی جاتی تھی: اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ تب تو تم کفر کرتے تھے۔ اب وہ فریاد کریں گے‘ پکاریں گے: اے رب ہمارے! تُو نے دو مرتبہ ہم پر موت وارد کی اور دو مرتبہ ہمیں زندہ کیا‘ اب ہم اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہیں۔ تسلیم کرتے ہیں کہ ہم سے خطا ہوئی۔ ہم نے غلطی کی۔ ہم نے کفر کیا۔ ہم نے زندگی اکارت گزار دی۔ جب ہم پر اتنے اَدوار آ چکے ہیں‘ دو مرتبہ تُو نے ہمیں مارا‘ دو مرتبہ زندہ کیا‘ تو کیا اب ہمیں ایک موقع اور نہیں مل سکتا؟ ﴿فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ ۝۱۱﴾ کیا یہاں سے نکلنے کی بھی کوئی سبیل ہے‘ نکلنے کا کوئی راستہ اور امکان ہے؟ اس میں ایک اپیل ہے اور اس کے ساتھ دلیل بھی ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت زیر درس میں الفاظ آئے ہیں: ﴿كُنْتُمْ اَمْوَاتًا﴾ ’’تم مُردہ تھے‘‘ جب کہ اس آیت میں ’’إماتة‘‘ کا لفظ ہے جو باب افعال سے مصدر ہے: ﴿اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَ اَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ﴾ ’’تُو نے دو مرتبہ ہمیں مارا اور دو مرتبہ ہمیں جِلایا (زندہ کیا)۔‘‘

حیاتِ انسانی: تین زندگیاں‘ دو اموات

ان دونوں مقامات پر غور کریں تو یہ حیاتِ انسانی کے پانچ اَدوار بنیں گے۔ پہلا دور عالَمِ ارواح میں ہماری حیات ہے‘ جبکہ ابھی ارواح کی تخلیق ہوئی تھی‘ اَجساد کی تخلیق نہیں ہوئی تھی۔ اُس وقت ہم نے اللہ تعالیٰ سے وہ عہد (عہدِ الست) کیا تھا جس کا ذکر ماقبل آیت میں آ چکا ہے: ﴿الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ﴾ ’’وہ لوگ جو اللہ کے عہد کو توڑتے ہیں اُس کے پختہ ہونے کے بعد‘‘ وہ عہد اُس عالَمِ ارواح میں ہوا تھا جہاں تمام انسانوں کی ارواح موجود تھیں۔ یہ ہماری زندگی کا پہلا دور ہے جو ہم گزار کر یہاں آئے ہیں۔ اُس کے بعد ہمیں سلا دیا گیا۔ نیند موت کی بڑی بہن ہے‘ تو ہماری خودشعوری ختم ہوگئی اور گویا اللہ تعالیٰ نے ہماری ارواح کو ایک بہت بڑے کولڈ سٹوریج میں رکھ دیا۔ اب عالَمِ خلق میں ایک ایک انسان کا ہیولیٰ رحمِ مادر میں تیار ہو رہا ہے۔

جب حضرت آدم علیہ السلام کا ہیولیٰ تیار ہوا تھا تو اُنؑ کی روح لاکر شامل کردی گئی۔ پھر حضرت آدمؑ کی نسل میں جو بھی توالد و تناسل ہوتا رہا اور جس طریقے سے نسل بڑھتی رہی تو رحم مادر میں ایک ایک انسانی بچے کا ہیولیٰ تیار ہوا اور اُس کی روح لاکر شامل کردی گئی۔ یہ ہے احیائے اُولیٰ۔ گویا روح کو جب سلا دیا گیا تو یہ اماتہ اوّلی ہے‘ یعنی پہلی مرتبہ موت وارد کرنا‘ سُلا دینا۔ اُس کے بعد یہاں روئے ارضی پر ہمیں زندہ کیا گیا۔ بقولِ غالب: ع ’’اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل!‘‘ اب ہم یہاں آئے ہیں ایک جسد کے ساتھ۔ وہ حیاتِ اوّلین بغیر جسد کے تھی‘ ہم ارواح کی شکل میں تھے۔ یہاں ہمیں ایک جسد دیا گیا ہے‘ یہ احیائے اولیٰ ہوگیا‘ یعنی پہلی مرتبہ کا زندہ کر دینا۔ اس کے بعد آئے گا اماتہ ثانیہ جب ہماری موت وارد ہوگی۔ اس موت کی صورت میں ہماری روح عالمِ بالا کی طرف جائے گی جبکہ ہمارا جسم یہاں پڑا رہ جائے گا۔ یہ پھر ایک نیند ہے۔ وہ جو میر نے کہا ہے:

مرگ اِک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر!

اس کو موت ہم اس معنی میں نہیں کہتے کہ کوئی معدوم ہوگیا۔ معاذ اللہ! یہ تو زندگی کی ایک کیفیت سے دوسری کیفیت میں منتقل ہوجانے کا نام ہے۔ اِدھر آنکھ بند ہوئی اور اُدھر عالمِ برزخ میں آنکھ کھل گئی۔ یہ تو خالص غیر شعوری کا دور بھی نہیں۔ پہلی موت تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک خالص غیر شعوری کا دور تھا۔ یہ تو غیر شعوری نہیں بلکہ نیم شعوری کا دور ہوگا۔ اس لیے کہ عذابِ قبر پر ہمارا ایمان ہے کہ عالم برزخ میں عذاب بھی ہوتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((إِنَّمَا الْقَبْرُ رَوْضَةٌ مِنْ رِيَاضِ الْجَنَّةِ أَوْ حُفْرَةٌ مِنْ حُفَرِ النَّارِ)) [سنن الترمذی: ۲۴۶۰] ’’قبر یا تو جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغیچہ ہے یا دوزخ کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔‘‘ یہ مختلف تعبیرات ہیں۔ حدیث میں یہ بھی آتا ہے کہ قبر میں جنت کی طرف سے کھڑکی کھول دی جاتی ہے یا جہنم کی طرف سے۔ یعنی جنت یا جہنم کے آثار اور کیفیات وارد ہونا شروع ہوجاتی ہیں۔ اُس کے بعد دوسرا اِحیاء ہوگا: ﴿ثُمَّ يُحْيِيكُمْ﴾۔

پس معلوم ہوا کہ حیاتِ انسانی کے پانچ اَدوار ہیں۔ دو اموات کا وقفہ ہے اور تین زندگیاں ہیں۔ پہلی زندگی عالمِ ارواح کی‘ شعور کے ساتھ‘ اس لیے کہ اگر شعور نہیں تھا تو عہد کے کیا معنی ہوئے! دُنیا میں بھی کوئی معاہدہ کرتا ہے تو کہتا ہے کہ مَیں بقائمی ہوش وحواس یہ عہد کرتا ہوں۔ ہم نے اپنے پورے شعور کے ساتھ یہ عہد کیا: ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى ۚ﴾ (الاعراف: ۱۷۳)۔ اُس کے بعد ہمیں سلا دیا گیا۔ یہ پہلی موت ہے۔ پھر جب ہماری آنکھ کھلی تو ہم اس عالم دنیا میں ایک جسم کے ساتھ آئے ہیں۔ ہمیں اَعضاء و جوارح دیے گئے ہیں۔ یہ ہے ہمارا امتحانی وقفہ‘ کہ کچھ کر کے دکھاؤ!

سورۃ الملک میں فرمایا: ﴿الَّذِیْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَكُمْ اَیُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ﴾ (آیت ۲) نوٹ کیجیے اس میں کس قدر باریکیاں ہیں۔ قرآن یہ نہیں کہتا: ’’خَلَقَ الْحَیَاۃَ وَالْمَوْتَ‘‘ بلکہ حیات کے بجائے موت کو مقدّم کر رہا ہے۔ اس لیے کہ اس دنیا میں آنے سے پہلے ایک موت ہم گزار آئے ہیں اور اُس موت کے بعد جو ہمارا اِحیاء ہوا ہے تو وہ درحقیقت یہ حیاتِ دُنیوی ہے۔ اس کے بعد اماتہ ثانیہ ہوگا اور اس کے بعد حیات کا تیسرا دور ہوگا۔ گویا ’’اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن‘‘ کے مابین انسانی حیات کے پانچ ادوار ہیں۔ موت معدوم ہونے کا نام نہیں بلکہ یہ حیات ہی کی ایک کیفیت ہے‘ ذرا نیم شعوری یا غیر شعوری کی کیفیت۔ ایک آدمی بالکل بے ہوش پڑا ہوا ہو تو اُس کو مُردہ تو نہیں کہتے‘ وہ بہرحال زندہ ہے لیکن اُس کو شعور نہیں ہے۔ اسی طرح جو موت ہمیں آنی ہے وہ نیم شعوری کی کیفیت ہے‘ غیر شعوری کی نہیں۔ البتہ جو موت اس دنیا میں آنے سے پہلے ہم گزار آئے ہیں وہ خالص غیر شعوری کی تھی۔ اُس سے پہلے شعورِ کامل تھا جس میں ہم نے اللہ سے عہد کیا۔ تو یہ ہیں پانچ ادوار۔

انسان کا وجودِ علمی

یہ مضامین تھوڑے سے پیچیدہ بھی ہیں‘ ان کی تفہیم میں انسان کے ڈگمگانے کا بھی اندیشہ ہے۔ عالمِ ارواح میں آنے سے پہلے ہماری کیا کیفیت تھی؟ اس کے بارے میں اہلِ فلسفہ اور اہلِ تصوف نے بہت کچھ کہا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ اُس وقت بھی ہمارا ایک

وجود تو تھا' جو وجودِ ذہنی تھا علم خداوندی میں۔ علامہ اقبال کا بہت بلند پایہ شعر ہے:۔

بضمیرت آرمیدم تو بجوشِ خود نمائی
بکنارہ برفگندی دُرِ آبدارِ خود را!

''اے اللہ! مَیں تیری ہستی کے اندر آرام سے سویا ہوا تھا' پھر تُو نے خودنمائی کے جوش میں اپنے اس چمک دار موتی کو کنارے پر پھینک دیا۔''

مَیں تیری ہستی کے اندر آرام سے سویا ہوا تھا... اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ کہ میری ذات کا علم اللہ تعالیٰ کو ہمیشہ سے ہے۔ مَیں اور میرا وجود اِس دنیا میں ساٹھ سال پہلے آیا ہوگا۔ اُس سے ہزار ہا سال پہلے میری روح وجود میں آئی ہوگی' لیکن میری اس روح اور میرے اس مادّی جسم کا علم اللہ تعالیٰ کو تو ہمیشہ سے ہے۔ گویا میرا وجودِ علمی تو ہمیشہ سے ہے' وہ تو اللہ تعالیٰ کی ذات سے قائم تھا۔ جیسے سیپی کے اندر خوبصورت موتی بن رہا ہوتا ہے' یہ سیپی کی اپنی تخلیق ہے' اور پھر سیپی کا منہ کھلتا ہے اور وہ اپنے موتی کو باہر پھینک دیتی ہے تاکہ دنیا کو معلوم ہو کہ اس نے کیا بنایا ہے اور اس کی تخلیق کس قدر حسین ہے! اے پروردگار! مَیں موجود تو تھا لیکن مجھے اپنا شعور نہیں تھا۔ تیری ذات کے اندر میری حیثیت ایک علمی وجود کی تھی۔ ہمارا وجودِ خارجی پہلے عالم ارواح میں روح کی حیثیت سے ہوا۔ اُس کے بعد ہم پر ایک نیند طاری کر دی گئی' گویا کولڈ سٹوریج میں ڈال دیے گئے۔ پھر ہمارا تعلق اس جسد کے ساتھ رحم مادر میں قائم کیا گیا۔

سورۃ المؤمنون کی آیات ۱۲ تا ۱۴ میں رحم مادر میں انسان کی تخلیق کے مراحل وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کے بعد آخر میں فرمایا: ﴿ثُمَّ اَنْشَاْنٰهُ خَلْقًا اٰخَرَ ؕ﴾ ''پھر ہم نے اسے ایک اور ہی مخلوق بنا کھڑا کیا''، یعنی اب یہ ایک بالکل نئی مخلوق ہے۔ اس سے کیا مراد ہے؟ اس کی تفصیل اس حدیث میں ملتی ہے جس کے راوی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں۔ یہ حدیث صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بایں الفاظ نقل ہوئی ہے:

((اِنَّ اَحَدَكُمْ يُجْمَعُ خَلْقُهٗ فِيْ بَطْنِ اُمِّهٖ اَرْبَعِيْنَ يَوْمًا نُطْفَةً، ثُمَّ يَكُوْنُ عَلَقَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يَكُوْنُ مُضْغَةً مِّثْلَ ذٰلِكَ، ثُمَّ يُرْسَلُ اِلَيْهِ الْمَلَكُ

فَيَنْفُخُ فِيهِ الرُّوحَ...))[1]

''تم میں سے ہر ایک کی تخلیق یوں ہوتی ہے کہ وہ (یعنی جنین) اپنی ماں کے پیٹ میں چالیس یوم تک نطفہ کی صورت میں' اس کے بعد اتنے ہی روز تک علقہ کی صورت میں' اور اس کے بعد اتنے ہی روز گوشت کے لوتھڑے کی صورت میں رہتا ہے۔ بعد ازاں اس کی طرف ایک فرشتہ بھیجا جاتا ہے' پس وہ اس میں روح پھونکتا ہے.....''

یعنی چالیس دن تک نطفہ' پھر چالیس دن تک علقہ اور اس کے بعد چالیس دن تک مُضغۃ، ایک سو بیس دن (چار ماہ) میں یہ تین مراحل مکمل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ ایک فرشتے کو بھیجتے ہیں۔ وہ کولڈ سٹوریج (عالَمِ ارواح) سے اس کی روح کو لا کر اس مادّی جسم کے ساتھ ملا دیتا ہے اور یوں ایک نئی مخلوق وجود میں آ جاتی ہے۔ اس حدیث کے مفہوم کو سمجھنے میں بھی لوگوں سے غلطی ہوئی ہے۔ عام طور پر یہی سمجھا گیا ہے کہ ایک سو بیس دن کے بعد اس جسم میں جان ڈال دی جاتی ہے۔ یعنی روح کو ''جان'' (life) سمجھا گیا ہے' جبکہ حقیقت یہ ہے کہ زندگی یا جان اس میں پہلے دن سے ہی موجود تھی۔ باپ کے نطفے کا خلیہ (spermatozoon) اور ماں کا بیضہ (ovum) بھی اپنی اپنی جگہ پر زندہ وجود ہیں اور ان دونوں کے اختلاط سے وجود میں آنے والا جفتہ (zygote) بھی۔ بہر حال ایک سو بیس دن کے بعد اس جسدِ حیوانی میں ''روح'' پھونکی جاتی ہے' جو ایک نورانی چیز ہے اور وہی اسے حیوان سے انسان بناتی ہے۔ اسی تبدیلی یا تخلیقی مرحلے کو ''خَلْقًا اٰخَرَ'' (ایک نئی تخلیق) سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ ہماری زندگی کا تیسرا دور ہے۔ اس کے بعد موت آئے گی' اور ہم نہیں کہہ سکتے کہ پھر کتنا طویل عرصہ عالَمِ برزخ میں پڑے رہیں گے۔ حضرت آدم علیہ السلام کے زمانے کے لوگ کتنے ہزار برس سے عالَمِ برزخ میں ہیں' ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ جو آخری زمانے کے لوگ ہوں گے' ظاہر ہے کہ اُن کا وقفہ تھوڑا ہوگا اور جو پہلے زمانوں میں وہاں پہنچ چکے' اُن کی عالَمِ

(۱) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب خلق آدم وذریتہ۔ وصحیح مسلم' کتاب القدر' باب کیفیۃ خلق الآدمی فی بطن امہ ...

برزخ کی زندگی زیادہ ہے۔ البتہ بعد میں آنے والوں کی جو پہلی ''موت'' تھی وہ لمبی تھی۔ یعنی عالم ارواح کے بعد اس دنیا میں آنے تک کا ان کا وقفہ لمبا تھا' لیکن یہ سارا عددی (quantative) فرق ہے۔ اصل میں وہی پانچ ادوار ہیں۔ ان ادوار سے پہلے ہمارا وجود علمی تھا' ذاتِ باری تعالیٰ میں علم کی حیثیت سے ہمارا ایک تشخص اور ایک وجود تھا۔

ارواحِ انسانی کا ذاتِ باری تعالیٰ سے تعلق

اب یہاں بھی خاص طور پر نوٹ کیجیے کہ لفظ ثُمَّ آیا ہے' اور یہ تراخی (تاخیر) کے لیے آتا ہے۔ اس اعتبار سے چار مراحل پر بات ختم نہیں ہوگئی' بلکہ فرمایا: ﴿ثُمَّ اِلَیۡہِ تُرۡجَعُوۡنَ﴿۲۸﴾﴾ ''پھر تم اُسی کی طرف لوٹا دیے جاؤ گے۔'' ہوسکتا ہے بعض لوگوں کو ان فلسفیانہ باتوں سے دلچسپی نہ ہو' کہ ہمارے عام اہلِ سنّت کے عقائد سے ان کا تعلق نہیں ہے۔ بہرحال علمی دلچسپی کے طور پر آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ یوں سمجھیے کہ جہاں تک ارواحِ انسانی کا معاملہ ہے اُن کا پھر ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ایک تعلق قائم ہوجائے گا۔ اس دنیا میں بھی روحِ انسانی کا براہِ راست ربط و تعلق ذاتِ باری تعالیٰ کے ساتھ ہے' جس طرح سورج کی شعاؤں کا کروڑہا میل دور آکر بھی سورج سے سلسلہ منقطع نہیں ہوتا۔ ایک کرن اپنے منبع سے علیحدہ اور جدا نہیں ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ سورج کی شعاؤں کے اندر بھی اس کی طرف واپسی (return to the sun) کا ایک رجحان (tendency) ہے' کہ یہ چکّر لگا کر اور ایک curve بنا کر واپس اپنے مرکز اور منبع کی طرف لوٹتی ہیں۔ چنانچہ ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ'' کے اوّل و آخر ذاتِ باری تعالیٰ ہے۔

مختصراً یہ کہ ''اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡنَ'' کے مابین حیاتِ انسانی کے پانچ ادوار ہیں۔ پہلا دور عالمِ ارواح میں شعور کے ساتھ۔ دوسرا دور بے شعوری کے ساتھ پہلی نیند' اور یہ پہلی موت ہے جو ہم گزار آئے۔ تیسرا دور حیاتِ دُنیوی اس جسدِ مادّی کے ساتھ جس میں شعور بھی ہے حیات بھی ہے۔ چوتھا دور موت کے بعد نیم شعوری کا' یعنی حیاتِ برزخی۔ پانچواں دور حیاتِ اُخروی۔

ارشاد ہوا: ﴿کَیۡفَ تَکۡفُرُوۡنَ بِاللّٰہِ.....﴾ ''تم کیسے انکار کرتے ہو اللہ کا.....؟''

ذرا غور تو کرو‘ اللہ تعالیٰ نے تمہیں کن کن اَدوار سے گزارا ہے! مجھے مولانا رومؒ کا ایک شعر یاد آ رہا ہے‘ اگرچہ انہوں نے وہ ارتقاء کے سلسلے میں کہا ہے ؎

ہفت صد و ہفتاد قالب دیدہ ام
ہم چو سبزہ بارہا روئیدہ ام!

یعنی مَیں سات سو اسّی پیکر تو پہلے ہی بیت آیا ہوں‘ نمعلوم کن کن شکلوں میں۔ کبھی مَیں جمادات میں تھا‘ پھر نباتات میں آیا‘ پھر حیوانات میں آیا۔ ارتقاء کے مراحل طے ہوئے‘ کہیں سے کہیں پہنچا۔ مجھے کیا اندیشہ ہے کہ موت مجھ میں کچھ کمی کر دے گی! مَیں مرنے سے کچھ کم ہو جاؤں گا؟ میری اگلی منزل تو پہلے سے بہتر آ رہی ہے۔ اگر انسان سیدھے راستے پر آ جائے‘ حق پر آ جائے‘ ہدایت پر آ جائے تو ﴿وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى ۝۴﴾ (الضحیٰ) کے مصداق اُس کی ہر آنے والی منزل پچھلی منزل سے بہتر ہوگی۔ اُس کے لیے تو درحقیقت ترقی ہی ترقی ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ ۝۱۹﴾ (الانشقاق) ’’تم لازماً چڑھو گے درجہ بدرجہ۔‘‘ تم بلند ہو گے طبقاً طبقاً‘ درجہ بدرجہ‘ سیڑھی بہ سیڑھی۔ بہرحال سورۃ البقرۃ کی اس آیتِ مبارکہ (آیت ۲۸) کو سورۃ المؤمن کی آیات ۱۰ اور ۱۱ کے ساتھ ملا کر تدبّر کیا جائے تو حیاتِ انسانی کے یہ پانچ مراحل سامنے آتے ہیں۔ ایک موت اِدھر اور ایک موت اُدھر‘ درمیان میں یہ حیاتِ دُنیوی ہمارا امتحانی وقفہ ہے۔ ؎

قلزمِ ہستی سے تُو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی!

اس دنیا میں تمہیں جسم دے کر بھیجا گیا ہے۔ ہاتھ پاؤں دیے‘ صلاحیت دی۔ جسم کے اندر طاقت رکھی۔ تمہارے اندر اُمنگ رکھی۔ اب کچھ کر کے دکھاؤ! آؤ‘ یہ گوئے (گیند) ہے اور یہ چوگان! do your worth ثابت کرو کہ تم کیا ہو!

واضح رہے کہ موت کو بھی قرآن نے ایک سلبی حقیقت نہیں کہا‘ بلکہ فرمایا: ’’خَلَقَ الْمَوْتَ‘‘ (موت کو پیدا کیا)‘ اور جس چیز کو پیدا کیا جاتا ہے درحقیقت وہ معدوم شے نہیں

ہوتی۔ وہ بھی ایک مثبت حقیقت ہے‘ منفی حقیقت نہیں ہے۔ چنانچہ موت سلبی کیفیت کا نام نہیں ہے۔ ﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَ الْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ ’’اُس نے موت اور زندگی کو پیدا کیا ہے تاکہ وہ تمہیں آزمائے (پرکھے‘ جانچے اور امتحان لے) کہ کون ہے تم میں سے بہتر عمل کرنے والا!‘‘

آیت ۲۹ هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۚ ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ ؕ وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۲۹﴾ ’’وہی (اللہ) ہے جس نے پیدا کیا تمہارے لیے جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کا سب‘ پھر وہ متوجّہ ہوا آسمانوں کی طرف اور انہیں ٹھیک ٹھیک سات آسمانوں کی شکل میں بنا دیا۔ اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔‘‘

زمین پر انسان کی حیثیت

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۚ﴾ ’’وہی (اللہ) ہے جس نے بنایا ہے تمہارے لیے جو کچھ زمین میں ہے کُل کا کُل۔‘‘ یہ بات دراصل اگلے رکوع کی تمہید کے طور پر آ رہی ہے۔ دونوں رکوعوں کے مضامین میں باہم ربط ہے۔ جو کچھ زمین میں ہے‘ کُل کا کُل انسان کے لیے بنایا گیا ہے۔ اسی سے پھر وہ خلافت کا مضمون متعلق ہو جائے گا جو اگلے رکوع میں بڑے اہتمام اور شان کے ساتھ بیان ہو رہا ہے۔

قرآن مجید میں جہاں یہ مضمون بیان ہو کہ زمین اور آسمان کی ہر شے تمہارے لیے مسخر کر دی‘ وہاں ’’سَخَّرَ لَكُمْ‘‘ آتا ہے‘ البتہ یہاں صرف زمین کا ذکر ہے‘ اور فرمایا کہ تمہارے لیے بنایا گیا ہے جو کچھ بھی زمین میں ہے کُل کا کُل۔ ’’جَمِیْعًا‘‘ کا کچھ اور مفہوم بھی بعض لوگوں نے لیا ہے کہ یہ سب کے لیے ہے یعنی یہ مشترکہ ملکیت ہے‘ مشترک مفاد کے لیے ہے‘ انتفاع سب کا مشترک ہونا چاہیے۔ خالص نحوی اعتبار سے اگرچہ اس کا امکان موجود ہے‘ لیکن میرے نزدیک الفاظ کا جو دروبست ہے‘ جو سیاق و سباق ہے اُس کے اعتبار سے مفہوم یہی ہے کہ جو کچھ زمین میں ہے کُل کا کُل تمہارے لیے بنایا گیا ہے۔

البتہ سورۂ لقمان کی آیت ۲۰ میں فرمایا گیا:

﴿اَلَمۡ تَرَوۡا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ﴾

''کیا تم دیکھتے نہیں کہ اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے وہ تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔''

اور یہی سورۃ الجاثیہ میں آیا ہے:

﴿وَ سَخَّرَ لَکُمۡ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ جَمِیۡعًا مِّنۡہُ ؕ﴾ (آیت ۱۳)

''اور اُس نے تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے کُل کا کُل جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے۔''

تسخیر کے دو مفہوم

اس ''مسخر'' کے بھی دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ سب کچھ تمہاری خدمت میں لگا دیا ہے' تمہاری ضروریات کی بہم رسانی میں لگا دیا ہے۔ سورج تمہاری فصلیں پکا رہا ہے' تمہاری ہواؤں کو حرکت میں لا رہا ہے' پانی کو بخارات کی شکل میں اوپر لے جا رہا ہے' بارش کے برسنے کا نظام ہے۔ سب مظاہرِ فطرت تمہارے نوکر چاکر ہیں۔ تمہارے فائدے اور خدمت کے لیے مامور ہیں۔ دوسرے یہ کہ ''سَخَّرَ لَکُمۡ'' میں یہ نکتہ بھی ہے کہ انسان کی تسخیر کی رسائی پوری کائنات پر محیط ہے۔ ''جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے وہ تمہارے لیے مسخر کر دیا ہے۔'' یعنی تمہاری رسائی میں ہے۔ تم ان پر قابو پاؤ' ان پر کنٹرول حاصل کرو' ان کو ایکسپلائٹ کرو۔ ان سے کام لو' ان سے فائدہ اُٹھاؤ! اس کی قوت اور صلاحیت بھی تمہیں دے دی گئی ہے۔

اس اعتبار سے ''تسخیرِ کائنات'' اس دور میں ''دجالیت'' اس لیے بن گئی ہے کہ صرف مادّی علم بڑھتا جا رہا ہے جبکہ انسان نے اپنا رشتہ اپنے خالق سے توڑ لیا ہے۔ ستاروں اور سیاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے' عناصرِ فطرت کو قابو میں لا رہا ہے۔ تمام قوانین قدرت اُس کے علم میں آ رہے ہیں' تمام عناصر پر اُس کا اقتدار اور غلبہ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ معلوم ہوا کہ تسخیر کے یہ دونوں مفہوم اپنی جگہ پر صحیح ہیں۔

ارض وسماء کی تخلیق میں ترتیبِ زمانی

﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ﴾ ''پھر وہ متوجہ ہوا بلندی کی طرف''۔ ''اِسْتَوٰی'' کا مادّہ ''س و ی'' ہے اور باب استفعال میں اس کے معنی ہیں: برابر یا سیدھے کھڑے ہوجانا۔ خطِ استواء وہ فرضی خط ہے جو ہمارے اس کرۂ ارضی کو دو برابر حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ''اِسْتَوٰی'' کے بعد جب صیغہ ''اِلٰی'' آتا ہے تو معنی ہوتا ہے سیدھے ہوجانا کسی شے کی طرف' یعنی اُس شے کا قصد کرنا' ارادہ کرنا' اُس کی طرف متوجہ ہوجانا۔ فرمایا کہ پھر وہ بلندی کی طرف یعنی آسمان کی طرف متوجہ ہوا۔ ﴿فَسَوّٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ﴾ ''اور اُس نے انہیں برابر کر دیا سات آسمانوں کی صورت میں۔'' یہ اُسی مادّہ ''س و ی'' سے باب تفعیل ہے۔ سَوّٰی یُسَوِّی تَسْوِیَۃً: برابر کر دینا' درست کر دینا' ہموار کر دینا۔

﴿وَهُوَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ﴾ ''اور وہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔''

﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ﴾ میں کلمہ ''ثُمَّ'' بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اگرچہ عام تصور تو ذہن میں یہ بنتا ہے کہ اِس پوری کائنات کی تخلیق ہوئی ہے تو پھر اُس میں کہیں زمین کی بھی تخلیق ہوئی ہے' لیکن قرآن مجید جس چیز کو ''آسمانوں اور زمین'' سے تعبیر کرتا ہے ان کی تخلیق میں ترتیب یہ بتاتا ہے کہ پہلے زمین کی تخلیق ہوئی ہے' پھر آسمانوں کی تشکیل اور صورت گری ہوئی ہے۔ اس لیے کہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ ''ثُمَّ'' تراخی کے لیے آتا ہے' یعنی کسی شے کے کسی شے کے بعد آنے کے لیے یہ دلیل قطعی ہے۔ چنانچہ از روئے قرآن ارض وسماء کی تخلیق میں ترتیبِ زمانی یہ ہے کہ زمین کی تخلیق پہلے ہوئی ہے اور حیاتِ ارضی کے لیے جو ضروری اشیاء ہیں وہ بھی پہلے تخلیق کر دی گئیں۔ اس کے بعد آسمان کی تخلیق اپنے تکمیلی مرحلہ میں داخل ہوئی۔ یہ مضمون قرآن کریم میں دوسرے مقام پر بڑی تفصیل سے آیا ہے' جو اجمالاً آپ کے سامنے آجانا چاہیے۔ یہ سورۂ حٰمٓ السجدۃ کے دوسرے رکوع کی آیات ہیں اور ان میں بھی انداز وہی ہے جیسے ہم یہاں دیکھ رہے ہیں: ﴿كَیْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ﴾۔ وہاں ارشاد ہے:

﴿قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗ

اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۹﴾

''(اے نبی ﷺ! آپ ان سے) کہیے: کیا تم لوگ کفر کر رہے ہو اُس ہستی کا جس نے زمین کو بنایا دو دنوں میں؟ اور تم اُس کے لیے مدِمقابل ٹھہرا رہے ہو! وہ ہے تمام جہانوں کا ربّ۔''

اے نبی! ان سے کہیے: کیا تم واقعی کفر کرتے ہو؟ یہ متجسّسانہ (searching) قسم کا انداز ہے کہ تمہارا کفر مصنوعی ہے‘ دل میں تم مانتے ہو! کیا تم واقعی اُس ہستی کا کفر کر رہے ہو جس نے زمین کو دو دنوں میں پیدا کیا؟ کیا تم واقعی اُس کے لیے مدِمقابل سمجھتے ہو؟ یعنی اگر تم خود بھی اپنے گریبان میں جھانکو گے‘ اپنے دل کو ٹٹولو گے تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری فطرت اس سے انکار کرتی ہے کہ اس کے مدّمقابل بھی کوئی ہے۔ یہ لفظ (اَنْدَادًا) سورۃ البقرہ میں بھی آچکا ہے: ﴿فَلَا تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ اَنْدَادًا وَّ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾ ''پس تم اللہ کے مدّمقابل اور ہمسر نہ قرار دے دو‘ جانتے بوجھتے۔'' یہاں فرمایا کہ وہی ہے تمام جہانوں کا مالک اور پروردگار۔

﴿وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۝۱۰﴾

''اور اس میں اُس نے بنائے پہاڑوں کے لنگر اس کے اوپر سے‘ اور اس میں برکات پیدا کیں اور اس میں اندازے مقرر کیے اس کی غذاؤں کے‘ چار دنوں میں۔ تمام سائلین کے لیے برابر۔''

پہاڑوں کے بارے میں یہ جیالوجی کا issue ہے کہ یہ کس طور سے وجود میں آئے ہیں۔ قرآن کریم نے ایک تصور یہ دیا ہے کہ جیسے اُوپر سے کوئی شے گاڑ دی جائے۔ دوسرے مقام پر انہیں ''اَوْتَاد'' (میخیں) بھی قرار دیا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے خلا سے کسی میٹیریل کی اس طرح سے مادّی بوچھاڑ ہوئی ہو کہ وہ زمین میں دھنس گیا ہو اور پھر اُس نے پہاڑوں کی شکل اختیار کی ہو۔ واللہ اعلم!

قرآن مجید میں متعدد مرتبہ آیا ہے کہ آسمانوں اور زمین کی تخلیق چھ دنوں میں ہوئی

ہے۔ظاہر ہے کہ وہ ہمارے چھ دن نہیں ہیں۔ ہمارے چوبیس گھنٹے کے دن کو اس پر قیاس نہیں کیا جائے گا۔قرآن کی رو سے اللہ تعالیٰ کا ایک دن ہزار برس کا بھی ہے' پچاس ہزار برس کا بھی۔کل کائنات کا دن کیا ہوگا' ہم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ تاہم جدید اصطلاح میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاید Six Millenniums یا Six Eras میں آسمانوں اور زمین کی تخلیق ہوئی ہے۔ابھی مَیں اس کو کُل کائنات نہیں کہہ رہا' اس لیے کہ ہوسکتا ہے آسمانوں اور زمین سے مراد کُل کائنات ہو' یا ہوسکتا ہے کہ اُس کا کوئی ایک حصہ ہو' کوئی خاص galaxy ہو' اور یہ خاص بلندیوں کا سلسلہ اسی کے اندر مکمل ہو جاتا ہو۔واللہ اعلم! یہ تمام چیزیں ابھی متشابہات کے درجے میں ہیں۔کائنات کی تخلیق کے حوالے سے ہمارا Cosmology کا علم اور ہماری معلومات بہت محدود ہیں۔ بہرحال قرآن کے مطابق اللہ تعالیٰ نے دو دن میں زمین کی تخلیق فرمائی۔ پھر مزید دو دن میں اس میں پہاڑوں کے لنگر جما دیے اور اس میں برکت پیدا کر دی ﴿بٰرَكَ فِيْهَا﴾۔ یہ وہ چیز ہے کہ جس سے حیات کی نشوونما ہو سکے۔کسی شے میں کوئی خیر مضمر ہو' پھر وہ ظہور پذیر ہو جائے تو وہ برکت ہے۔مزید یہ کہ ﴿وَقَدَّرَ فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا﴾ ''اور اُس میں ساری کی ساری غذاؤں کے اندازے مقرر کر دیے۔'' اَقْوَات جمع ہے قُوت کی۔ (''قوتِ لایموت'' کی اصطلاح ہم استعمال کرتے ہیں' یعنی اتنی غذا جو زندہ رہنے کے لیے ضروری ہو۔) انسان اور حیوانات کی تخلیق سے قبل ان کی جو بھی ضروریات تھیں' اللہ تعالیٰ نے پوری فرما دیں۔ سارا حیات بخش اور حیات پرور مواد پہلے فراہم کر دیا۔زمین کی مٹی کو روئیدگی کے قابل بنایا۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ پہلے اس کی مٹی میں صرف inorganic compounds پائے جاتے تھے' جنھوں نے organic compounds کی شکل اختیار کرنے میں وقت لیا ہے۔زمین کے اندر وہ ساری صلاحیت پیدا ہوگئی جس سے حیات کا ظہور بھی ہو' اور زمینی حیات چاہے وہ نباتاتی ہو یا حیواناتی' اُس کی نشوونما کے لیے جو بھی ضروری عوامل ہیں وہ مہیا ہو جائیں۔ ﴿فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ﴾ یہ بات چار دنوں میں مکمل ہوئی۔ ﴿سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ﴾ برابر ہے تمام سوال کرنے والوں کے لیے۔یعنی جو لوگ بھی زمین و آسمان کی تخلیق کے

بارے میں سوال کریں‘ ان سب کے لیے یہ یکساں جواب ہے۔ اس کا ایک مفہوم یہ بھی لیا گیا ہے کہ سب مانگنے والوں کے لیے اس میں برابر حصہ ہے۔ جتنی بھی مخلوقات ہیں وہ گویا اپنے وجود سے ہی سوالی ہیں‘ محتاج ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کی طلب و حاجت کے مطابق ٹھیک اندازے سے ان کی ضروریات کا سارا سامان اس زمین میں مہیا کر دیا ہے۔

﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَهِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ⑪﴾

’’پھر وہ آسمان کی طرف متوجّہ ہوا‘ اور ابھی وہ ایک دھواں سا تھا‘ تو اُس نے آسمان اور زمین سے کہا کہ تم دونوں چلے آؤ خوشی سے یا جبراً! ان دونوں نے کہا کہ ہم حاضر ہیں پوری آمادگی کے ساتھ۔‘‘

آیت کے آغاز میں وہی الفاظ آئے ہیں جو سورۃ البقرۃ میں آئے ہیں: ﴿ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ﴾ مزید فرمایا: ﴿وَهِيَ دُخَانٌ﴾ ’’اور ابھی وہ ایک دھواں سا تھا۔‘‘ یہاں لفظ ’’دُخان‘‘ بہت اہم ہے۔ یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب آسمان ایک دھویں کی شکل میں تھا اور ابھی سات آسمانوں کی الگ الگ صورتیں وجود میں نہیں آئی تھیں۔ ان آیات میں کائنات کی تخلیق کے ابتدائی مرحلے سے متعلق کچھ اشارے پائے جاتے ہیں۔ سائنسی شواہد کے مطابق Big Bang کے بعد آگ کا ایک بہت ہی بڑا گولا وجود میں آیا۔ پھر اس گولے میں مزید دھماکے ہوئے اور اس طرح اس مادّے کے جو حصے علیحدہ ہوئے ان سے کہکشائیں بننا شروع ہوئیں۔ دھوئیں کی شکل میں گویا ایک homogeneous mass تھا‘ جیسے کہ ہوا کے اندر نمی کے ذرات پوری طرح منتشر ہوں‘ جس سے آسمانوں کی ہیئت وجود میں آئی۔ واللہ اعلم!

پھر اللہ تعالیٰ نے حکم دیا اُس دخان کو بھی اور زمین کو بھی کہ آؤ‘ ہمارا حکم بجالانے کے لیے‘ ہمارے فرمان کو سننے اور اس کی اطاعت کرنے کے لیے دونوں کے دونوں حاضر ہو جاؤ‘ طوعاً و کرھاً‘ خواہ اپنی خوشی سے یا جبراً۔ دونوں نے کہا: ہم حاضر ہیں اپنی پوری آمادگی کے ساتھ۔

﴿فَقَضٰىهُنَّ سَبۡعَ سَمٰوٰتٍ فِیۡ یَوۡمَیۡنِ وَ اَوۡحٰی فِیۡ کُلِّ سَمَآءٍ اَمۡرَهَا ؕ وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ ۟ وَ حِفۡظًا ؕ ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿۱۲﴾﴾

''پھر اُس نے ان کو سات آسمانوں کی شکل دے دی دو دنوں میں' اور اُس نے وحی کر دیا ہر آسمان پر اس کا حکم۔ اور ہم نے آسمانِ دُنیا کو چراغوں سے مزیّن کر دیا اور اس کی خوب حفاظت کی۔ یہ اُس ہستی کا بنایا ہوا اندازہ ہے جو زبردست ہے اور کُل علم رکھنے والا ہے۔''

پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو تقسیم کر دیا سات آسمانوں کی شکل میں دو دنوں میں' اور ہر آسمان میں اللہ تعالیٰ نے اُس کے حصے کا کام وحی کر دیا۔ گویا دو جمع دو' جمع دو' کل چھ دن۔ قرآن حکیم میں سات مقامات پر یہ ذکر ملتا ہے کہ زمین و آسمان کی تخلیق چھ دنوں میں ہوئی' لیکن یہ قرآن کا واحد مقام ہے جہاں نہ صرف ان چھ دنوں کی مزید تفصیل (break up) دی گئی ہے بلکہ اس تخلیقی عمل کی ترتیب (sequence) کے بارے میں بھی بتایا گیا ہے۔ یعنی پہلے زمین بنی اور سات آسمان اس کے بعد وجود میں آئے۔ لیکن ابھی تک ہم نہ تو مذکورہ چھ دنوں کے مفہوم کو سمجھ سکے ہیں اور نہ ہی زمین و آسمان کے تخلیقی عمل کی ترتیب سے متعلق سائنٹیفک انداز میں کچھ جان سکتے ہیں۔ بہرحال ہمارا ایمان ہے کہ مستقبل میں کسی وقت سائنس ضرور ان معلومات تک رسائی حاصل کرے گی اور انسان اس حقیقت کی تہ تک ضرور پہنچ جائے گا کہ زمین و آسمان کے وجود میں آنے کی صحیح ترتیب وہی ہے جو قرآن نے بیان فرمائی ہے۔

﴿وَ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنۡیَا بِمَصَابِیۡحَ ۟ وَ حِفۡظًا ؕ﴾ اور جو سب سے قریب کا آسمان ہے اس کو چراغوں سے مزین کر دیا اور حفاظت کا ذریعہ بنا دیا۔

﴿ذٰلِکَ تَقۡدِیۡرُ الۡعَزِیۡزِ الۡعَلِیۡمِ ﴿۱۲﴾﴾ یہ سارا اندازہ مقرر کیا ہوا ہے اُس ہستی کا جو زبردست ہے اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

سورۃ البقرۃ میں اس مضمون کے اختتام پر یہ الفاظ آئے ہیں: ﴿وَ ہُوَ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۲۹﴾﴾ ''اور وہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔'' یعنی زمین و آسمان کی تخلیق کے بعد وہ ان سے غافل نہیں ہو گیا۔ دراصل فلسفیانہ افکار میں اس قسم کا ایک تصور بھی موجود ہے کہ

کائنات کا خالق تو بے شک اللہ تعالیٰ ہی ہے' لیکن کائنات بنانے کے بعد وہ فارغ ہوا۔ اب یہ کائنات آپ سے آپ چل رہی ہے۔ خالق کو اس کی تفصیلات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے کہ اس وسیع وعریض کائنات کے کس حصے میں کیا واقعہ ظہور پذیر ہو رہا ہے! جیسے ایک فٹ بال کو زوردار کک لگادی گئی ہے' اب وہ اپنے آپ لڑھکتا جا رہا ہے اور اُس کک لگانے والے سے فٹ بال کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن مجید اس تصور کی نفی کرتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الحدید میں فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِیْ سِتَّةِ اَیَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰی عَلَی الْعَرْشِ ؕ یَعْلَمُ مَا یَلِجُ فِی الْاَرْضِ وَمَا یَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا یَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا یَعْرُجُ فِیْهَا ؕ وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ۝۴﴾

''وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں' پھر وہ متمکن ہوا عرش پر۔ وہ جانتا ہے جو کچھ داخل ہوتا ہے زمین میں اور جو کچھ نکلتا ہے اس سے' اور جو کچھ اُترتا ہے آسمان سے اور جو کچھ چڑھتا ہے اس میں۔ اور تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اُسے دیکھ رہا ہے۔''

یہاں بہت سی چیزوں کا احاطہ ہو گیا' مثلاً زمین میں پانی جذب ہوتا ہے' مختلف قسم کے بیج بوئے جاتے ہیں' مُردے دفن ہوتے ہیں۔ اسی طرح آسمان سے بارش نازل ہوتی ہے اور فرشتے احکامِ الٰہی لے کر اُترتے ہیں۔ آسمان کی طرف چڑھنے کی مثال بخارات کی ہے۔ فرشتے بھی فوت ہونے والے انسانوں کی ارواح اور دنیا کے حادثات وواقعات کی رپورٹس لے کر اوپر جاتے ہیں۔ ''یَعْلَمُ'' کے ساتھ (چار بار) آنے والے ''مَا'' میں جو عمومیت ہے وہ ہر شے پر محیط ہے۔ جو کچھ بھی زمین میں گھستا ہے اور نکلتا ہے' ہر کونپل جو پھوٹ رہی ہے اور ہر بیج سے جو پتیاں نمودار ہو رہی ہیں' وہ اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ جو کچھ آسمان کی بلندیوں سے اترتا ہے یا جو اوپر چڑھتا ہے' آسمانوں کی طرف عروج کرتا ہے' سب کا سب اُس کے علم میں ہے۔ وہ اپنے ہی آپ میں کہیں علیحدہ سے مگن نہیں ہے۔ وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو۔ وہ بصیر ہے۔ ہر چیز کو وہ خود دیکھ رہا ہے' اُس کا

مشاہدہ کر رہا ہے۔ یہ تصور ذہن میں رہنا ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ ہم رکوع کے اختتام تک پہنچ گئے ہیں۔ اس آخری آیت کا اصل ربط اگلے رکوع سے ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ تمہیں اتنے ادوار سے' کن کن منازل میں سے گزار کر لایا ہے' اور پھر تمہارے لیے پیدا کیا ہے جو کچھ بھی زمین میں ہے۔ یہ ہے انسان کا مرتبہ و مقام اور اس کی حیثیت و اہمیت! حدیثِ مبارکہ میں بھی اس مضمون کی بڑی خوبصورت تعبیر آئی ہے: ((اِنَّ الدُّنْیَا خُلِقَتْ لَکُمْ وَاَنْتُمْ خُلِقْتُمْ لِلْآخِرَۃِ)) (۲) ''یہ دنیا تمہارے لیے بنائی گئی ہے لیکن تم آخرت کے لیے بنائے گئے ہو۔'' تمہارا اصل گھر یہ نہیں' آخرت کا گھر ہے۔ یہ تو تمہاری آزمائش کے لیے ایک میدانِ عمل فراہم کیا گیا ہے' یہ کمرۂ امتحان ہے۔ یہاں تو تمہیں کچھ صلاحیتیں دے کر آزمایا جا رہا ہے۔

اس کے فوری بعد چوتھے رکوع میں خلافتِ ارضی کی بات شروع ہوگی۔ اس سے انسان کی زمین پر حیثیت اور اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ع ''اپنی خودی پہچان' او غافل انسان!'' (جاری ہے) ❁❁❁

(۲) تخریج الاحیاء للعراقی ۲۵۲/۳۔ حافظ عراقی نے اسے منقطع قرار دیا ہے۔

ماہنامہ ''میثاق'' لاہور

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے قرآنی فکر کا ترجمان' ایک علمی' دعوتی اور تربیتی رسالہ!

صرف آپ ہی کے زیرِ مطالعہ کیوں؟

وقت اور حالات کی اشد ضرورت ہے کہ اسے ایک مشن سمجھ کر واعظین و مربّیین' تعلیمی اداروں' لائبریریوں' مکتبہ جات اور ہر گھر و فرد اور خاص طور پر الاقرب فالاقرب کی بنیاد پر اپنے دوست' احباب اور اعزّہ و اقرباء تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

یہ آپ کے لیے صدقہ جاریہ ہوگا!

تواصی بالحق

ڈاکٹر اسرار احمدؒ

خطبہ مسنونہ کے بعد:

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ —— بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ○

- قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی فِیْ سُوْرَۃِ الْعَصْرِ:

﴿وَالْعَصْرِ ① اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ② اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ ۙ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ ③﴾

- قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی فِیْ سُوْرَۃِ الْحُجُرَاتِ:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ؕ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ ⑮﴾

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْم

عَنِ الحَارِثِ اَلْاَشْعَرِیِّ ؓ قَال قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ :

((اَنَا آمُرُکُمْ بِخَمْسٍ، اَللّٰہُ اَمَرَنِیْ بِھِنَّ: بِالْجَمَاعَۃِ وَ السَّمْعِ وَ الطَّاعَۃِ وَ الْھِجْرَۃِ وَ الْجِھَادِ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ)) (سنن الترمذی، مسند احمد)

- وَقَالَ اَصْحَابُ الرَّسُوْلِ ﷺ فِیْ نَشِیْدٍ فِیْ غَزْوَۃِ الْاَحْزَابِ:

نَحْنُ الَّذِیْنَ بَایَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَی الْجِھَادِ مَا بَقِیْنَا اَبَدًا

(صحیح البخاری)

عَنْ عُبَادَۃَ بْنِ الصَّامِتِ ؓ: بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَ الطَّاعَۃِ فِی الْعُسْرِ وَ الْیُسْرِ، وَ الْمَنْشَطِ وَ الْمَکْرَہِ، وَ عَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا، وَ عَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ، وَ عَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ (متفق علیہ)

رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ○ وَ یَسِّرْ لِیْ اَمْرِیْ○ وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ○ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ○ اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَهُ وَ اَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَ ارْزُقْنَا اجْتِنَابَهُ، اَللّٰھُمَّ اَلْھِمْنَا رُشْدَنَا وَ اَعِذْنَا مِنْ شُرُوْرِ اَنْفُسِنَا، اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَ تَرْضٰی، اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا اَنْ نُّجَاھِدَ فِیْ سَبِیْلِکَ بِاَمْوَالِنَا وَ اَنْفُسِنَا، اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنَا شَھَادَةً فِیْ سَبِیْلِکَ ـــــ آمین یاربَّ العالمین!

ان اجتماعات میں جو سلسلہ کلام چل رہا ہے اس میں سورۃ العصر اور اس کی بیان کردہ چار شرائطِ نجات یعنی ایمان، عمل صالح، تواصی بالحق اور تواصی بالصبر کی وضاحت جاری ہے۔ ''حقیقتِ ایمان'' کی بحث میں ایمان اور عمل کا تعلق ''حقیقتِ عملِ صالح'' کے ضمن میں بیان کیا گیا جبکہ ایمان اور جہاد کا باہمی تعلق آج ''تواصی بالحق'' کے موضوع کے تحت بیان کیا جائے گا۔ سورۃ العصر میں جو چار شرائطِ نجات بیان ہوئی ہیں، ان میں ایمان اپنی جگہ ایک حقیقت ہے جبکہ باقی تینوں شرائط درحقیقت عمل صالح ہی کے مراحل ہیں۔ تواصی بالحق یعنی حق کی وصیت کرنا اور تواصی بالصبر یعنی صبر کی تاکید کرنا دونوں عمل صالح ہی کی صورتیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں اکثر و بیشتر مقامات پر یہ دو الفاظ ہی آتے ہیں: ﴿اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ کیونکہ عمل صالح میں جہاں انسان کے انفرادی معاملات شامل ہیں، وہاں اسی میں دوسروں کو حق کی تاکید کرنا اور صبر کی وصیت کرنا بھی شامل ہیں۔ گویا یہ تینوں چیزیں عملِ صالح ہی کے اجزاء ہیں۔

حکمتِ دین کا عظیم خزانہ

ان تینوں چیزوں کا ربط و تعلق سمجھنے کے لیے نبی اکرم ﷺ کی بتائی ہوئی مثال پر غور کر لیتے ہیں۔ یہ بڑی پیاری اور طویل حدیثِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام حکمتِ دین کا عظیم خزانہ ہے۔ جب غزوۂ تبوک کے لیے حضور ﷺ تشریف لے جا رہے تھے تو اس وقت تیس ہزار کا لشکر ساتھ تھا۔ ایک موقع ایسا آیا کہ لشکر نے ساری رات سفر کیا۔ پھر فجر کی نماز ادا کی اور دوبارہ روانہ ہوئے۔ اُس وقت تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر نیند کا غلبہ ہو گیا۔ نتیجتاً ان کے اُونٹ جن پر وہ سوار تھے، اِدھر اُدھر جانے لگے اور پورا لشکر منتشر ہو گیا۔ حضرت معاذ بن

جبل رضی اللہ عنہ اس حدیث کو روایت کرتے ہیں جن کی شان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: ((اَعْلَمُهُمْ بِالْحَلَالِ وَ الْحَرَامِ مُعَاذُ بْنُ جَبَلٍ))(سنن الترمذی:۳۷۹۱) یعنی میرے صحابہ میں حلال وحرام کے احکام کو سب سے زیادہ جاننے والے (فقہی احکام کے ماہر) معاذ بن جبلؓ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ بقیہ لوگ تو اُونگھ رہے تھے لیکن میں نے اپنی اُونٹنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُونٹنی کے ساتھ لگائے رکھی تاکہ میں تخلیہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک بات پوچھ سکوں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب اُونٹ پر سوار ہوتے تھے تو ایک کجاوا سا ہوتا تھا جس پر پردے ہوتے تھے۔ اچانک حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُونٹنی نے ٹھوکر کھائی۔ اس پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب چاروں طرف لشکر کو دیکھا تو منتشر پایا اور صرف حضرت معاذؓ انہیں اپنے قریب نظر آئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو آواز دی: ''یا معاذ!'' انہوں نے عرض کیا: ''لبیک یا رسول اللہ!'' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''قریب آجاؤ۔'' وہ آگئے' پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''اور قریب آجاؤ۔'' تو وہ اتنے قریب آگئے کہ دونوں اُونٹنیاں بالکل ساتھ سفر کر رہی تھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُن سے فرمایا: ''میں نہیں سمجھ رہا تھا کہ لشکر اتنا منتشر ہو جائے گا کہ لوگ مجھ سے اتنے فاصلے پر ہو جائیں گے۔'' حضرت معاذؓ نے لوگوں کی طرف سے معذرت پیش کرتے ہوئے فرمایا: ''لوگ رات بھر جاگے ہیں اس لیے ان پر نیند کا اثر ہو گیا ہے۔'' اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا: ''ہاں میں بھی اُونگھ رہا تھا۔'' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے موقع مناسب سمجھتے ہوئے کہا: ''مجھے اجازت دیجیے کہ میں آپ سے ایک سوال کروں جو سوچ سوچ کر میں بیمار ہو گیا ہوں' کمزوری کا شکار ہو گیا ہوں' بہت غمگین ہوں۔'' آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو پوچھنا چاہو' پوچھ لو۔'' عرض کرتے ہیں: ''وہ ایک بات بتا دیجیے جو مجھے جنت میں داخل کر دے' جہنم سے چھٹکارا دلا دے۔'' یہاں پر میرے اور آپ کے سوچنے کی بات یہ ہے کہ اونچے درجہ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی یہ نہیں سمجھتے تھے کہ چونکہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابی ہیں اس لیے ان کا جنت میں جانا یقینی ہے بلکہ اُن لوگوں کو ہر وقت یہی فکر دامن گیر رہتی تھی۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا: ''اللہ اور یومِ آخرت پر ایمان لاؤ' نماز قائم کرو' صرف اللہ کی عبادت کیا کرو' اس کے ساتھ

کسی کو شریک نہیں کرو، یہاں تک کہ اسی حال میں تمہاری موت آجائے۔'' پھر حضور اکرم ﷺ فرماتے ہیں: ''اے معاذ! کیا میں تمہیں نہ بتاؤں کہ دین میں جڑ' تنا اور اس کا عمود (چوٹی) کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کیا: ''میرے ماں باپ آپؐ پر قربان' ضرور بتایئے۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''کلمہ شہادت اس کی جڑ ہے یعنی تم اس بات کی گواہی دو کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور اس کے رسول ہیں۔ اس کا تنا نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ ادا کرنا ہے اور اس میں چوٹی کا عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ گویا کہ ایمان جڑ، عملِ صالح تنا اور تواصی بالحق پھل ہے۔''

اس تمثیل میں ایک چیز کا اضافہ کرلیا جائے تو بات بہتر طور پر سمجھ میں آسکتی ہے۔ جڑ تو ایمان ہے' تنا عملِ صالح ہے اور اس کے اوپر جو پھل لگتا ہے وہ تواصی بالحق ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ آم کی گٹھلی میں بالقوۃ آم کا پورا درخت موجود ہوتا ہے۔ گٹھلی جب زمین کے اندر ڈالی جاتی ہے تو اس سے آم کا پودا نکلتا ہے جو کہ وقت کے ساتھ تنا اور درخت بنتا ہے اور پھر اس کی چوٹی پر پھل آتا ہے۔ پھل میں گٹھلی ہوتی ہے جس کو زمین کے اندر ڈالنے سے پھر ایک نیا درخت وجود میں آجاتا ہے۔ بالکل اسی طرح ایمان ایک بیج یا گٹھلی کی مانند ہے۔ ہماری شخصیت کی مثال زمین کی طرح ہے۔ اگر ایمان ناقص نہ ہو' صحیح سالم ہو اور ہماری شخصیت بنجر نہ ہو تو ایمانِ صحیح اور باہمت' عزیمت والی شخصیت کے امتزاج سے ایمان تناور درخت کی شکل اختیار کرتا چلا جائے گا جس کی شاخیں عملِ صالح کی صورت میں سامنے آئیں گی جن پر تواصی بالحق کا پھل آجائے گا۔ یہ اُصول ہے کہ اگر عمل پختگی کو پہنچے گا تو ہمارے وجود سے حق لازماً دوسروں کو پہنچنا شروع ہوجاتا ہے' اسی کو تواصی بالحق کہتے ہیں۔

تواصی بالحق: لزوم کے دلائل

تواصی کا لفظ وصیت سے بنا ہے۔ اُردو زبان میں موت کے وقت نصیحت کرنے کو وصیت کہتے ہیں جبکہ عربی زبان میں کسی کو کسی بھی وقت بھلائی کی کوئی بات تاکیداً کہنا وصیت کہلاتا ہے۔ تَوَاصَوْا عربی میں بابِ تفاعل سے ہے۔ باب تفاعل کی خصوصیت مبالغہ کی ہے' یعنی تاکید اور زور شور سے حق کی وصیت کرنا۔ حق کے کئی معنی ہیں: ہر وہ شے

جو بالفعل (حقیقتاً) موجود ہو، ہر وہ شے جسے عقل تسلیم کرے، ہر وہ شے جو اخلاقاً واجب ہو۔ یعنی ہر اُس چیز کی تاکید کرنا جو مطابق واقعہ ہو، معقول ہو اور اخلاق کا تقاضا ہو۔ ان تمام چیزوں کا نام تواصی بالحق ہے۔ جیسے ایک آم کی گٹھلی سے مزید پھل نکلتے ہیں، اسی طرح جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کسی کو ایمان کی دولت اور عمل کی توفیق نصیب فرمائے اور وہ دوسروں کو وصیت ونصیحت اور دعوت وتبلیغ کرے تو گویا وہ وہی پودا کسی اور کے دل میں لگا رہا ہوتا ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس کے دل میں بھی ایمان کا بیج پڑ جائے اور عملِ صالح کی بہار آجائے، جیسے چراغ سے چراغ روشن ہوتا ہے یا شمع سے شمع جلتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعوت پر حضرات ابوبکر، علی، زید اور سیدہ خدیجہ رضی اللہ عنہم ایمان لے آئے اور اس طرح ایک سے پانچ کی قوت ہوگئی۔ اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دعوت پر عشرۂ مبشرہ میں سے چھ حضرات عثمان، زبیر، سعید، طلحہ، عبدالرحمٰن بن عوف اور سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم ایمان لے آئے۔

تواصی بالحق یعنی حق کو پھیلانا اور پہنچانے کا کام کرنا تین دلائل کی رُو سے ہر مسلمان پر لازم ہے۔

(۱) طبعی دلیل: اگر کسی جگہ پر آگ جل رہی ہو تو ماحول میں لازماً حرارت پہنچے گی، چاہے اس کو حاصل کرنے کی کوشش کی جائے یا نہ کی جائے۔ جب آگ کے سامنے آئیں گے تو حرارت ہی ملے گی۔ اسی طرح اگر کہیں برف کی سِل رکھی ہو تو ٹھنڈ ضرور ماحول میں سرایت کرے گی۔ بالکل اسی طرح اگر کسی شخص میں فی الواقع نیکی ہو تو اس کے اردگرد نیکی ضرور سرایت کرے گی، اور اگر ایسا نہیں ہو رہا تو اس کا معنی یہ ہوا کہ حقیقی نیکی نہیں ہے۔ نیکی کا محض ڈھونگ، لبادہ یا فریب ہے۔ نیکی کی حقیقی شکل یا روح نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ دعوت قبول کرنے کے حوالہ سے کچھ bad conductors بھی ہوتے ہیں، لیکن ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی بھی قبول نہ کرے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں نے آپؑ کی دعوت کو قبول کیا، ایک نے نہیں کیا۔ سو یہ دیکھنا ہوگا کہ اگر کسی شخص سے اس کے ماحول میں نیکی کی تاثیر واقعتاً کسی تک پہنچ ہی نہیں رہی تو وہ اپنے بارے میں سوچے کہ کہیں اُس نے نیکی کا لبادہ تو

نہیں اوڑھا ہوا ہے۔ نیکی کا سب سے پہلا اثر قریب ترین ماحول میں نظر آنا چاہیے۔ اگر کسی شخص کی نیکی کا اثر اس کے گھر میں نظر نہ آ رہا ہو تو یہ غیر متوازن کیفیت ہے۔ انسان کی شخصیت اس کے گھر والوں سے چھپی ہوئی نہیں ہوتی۔ نیکی کا لبادہ اوڑھ لینے سے گھر کے باہر کے لوگ تو متاثر ہو سکتے ہیں مگر یہ محض ظاہری نیکی ہوگی۔ اصل نیکی تو وہ ہے جو اپنے گھر والوں پر اثر انداز ہو۔ اگر ایسا نہیں ہو رہا تو کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہے۔ بہر حال جیسے آگ سے حرارت اور برف سے ٹھنڈک پھیلتی ہے، اسی طرح اگر نیکی حقیقتاً ہوگی، عمل واقعتاً صالح ہوگا تو اس سے ماحول میں نیکی لازماً سرایت کرے گی چاہے کم یا ہو زیادہ۔

(۲) شرافت و مروّت کا تقاضا: انسان جو چیز اپنے لیے پسند کرتا ہے، اپنے بھائی کے لیے بھی اُسے وہی پسند کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ)) (متفق علیہ) ''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے بھائی کے لیے وہی پسند نہ کرے جو اپنے لیے کرتا ہے۔'' اگر ایمان کو اپنے لیے خیر سمجھ کر قبول کیا ہے تو کیسے ممکن ہے کہ اپنے بھائی کو یا اپنے گھر والوں کو اس سے محروم رکھنا پسند کریں؟ یقیناً انسان جس شے کو اپنے لیے مفید سمجھتا ہے، اُسے اپنے گھر والوں کو اور پھر دوسروں کو بھی ضرور پہنچاتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے نیکی کی توفیق دی ہے تو اس کو تجوری میں بند نہیں رکھا جائے، ورنہ یہ بخیلی ہے۔ شرافت و مروّت کا تقاضا تو یہ ہے کہ اگر عقیدہ یا عمل کے اعتبار سے کوئی خیر، کوئی نیکی، کوئی بھلائی نصیب ہوگئی ہو تو اسے بانٹیں، share کریں، دوسرے لوگوں تک پہنچائیں۔ یہی تو اصی بالحق ہے۔

(۳) غیرت و حمیت کا تقاضا: رسول اللہ ﷺ نے ایک لرزا دینے والی حدیث میں ایک ایسے شخص کی غیرتِ دینی کے حوالہ سے نقشہ کھینچا جو خود تو نہایت ہی نیک، زاہد، متقی، عبادت گزار، دین دار ہو لیکن اُسے اپنے چاروں طرف حق کو مغلوب اور پامال دیکھ کر یہ احساس ہی نہ ہو رہا ہو کہ کس طرح حق کی دھجیاں بکھیری جا رہی ہیں، شریعت کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے، دین کا قانون سرِ عام توڑا جا رہا ہے جبکہ وہ فقط ''اللہ ھو'' کی تسبیح میں لگا ہوا ہو۔ ایک حدیثِ قدسی میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل علیہ السلام کو کسی بستی پر عذاب

دینے کا حکم دیا تو انہوں نے عرض کی کہ اس بستی میں تو ایک ایسا شخص بھی رہتا ہے جس نے پلک جھپکنے دیر بھی کبھی آپ کی نافرمانی نہیں کی۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب آیا کہ پہلے اُس پر بستی کو اُلٹ دو اور پھر دوسروں پر' کیونکہ اس کا چہرہ کبھی میری حمیت وغیرت میں متغیر نہیں ہوا۔ گویا ذاتی نیکی وعبادت گزاری ہرگز کافی نہیں ہوتی جب کہ ماحول میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے احکامات پامال ہو رہے ہوں' نواہی پھیل رہے ہوں اور منکرات کا اضافہ ہو رہا ہو۔

اگر ایمان حقیقی ہوگا تو عمل لازماً درست ہوگا' اسی طرح اگر نیکی واقعتاً ہوگی تو اس سے تواصی بالحق' دعوت اِلی اللہ' خیر کی تبلیغ' امر بالمعروف' نہی عن المنکر لازماً وجود میں آئیں گے۔ دوسری صورت میں تو تشویش ناک بات ہے کہ شاید اپنی نیکی کچی ہے' فریب ہے' حقیقت نہیں ہے۔

ایمان کی حقیقت اور عملِ صالح کے مراتب

ہمارے دین کا خلاصہ ایمان اور عملِ صالح ہے۔ ایمان کے عملی نتائج کیا ہونے چاہئیں؟ اصل دینی فرائض کیا ہیں اور ان کی اہمیت کیا ہے؟ آج اس کا مکمل نقشہ اپنے دل و دماغ میں اچھی طرح سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

سادہ سی مثال ہے کہ ایک شخص کو کہیں ملازمت پر رکھا گیا اور اس کو دس کام کرنے کو دیے گئے۔ اس شخص کو تین کام تو یاد رہے لیکن باقی سات کام وہ بھول گیا۔ اب چاہے وہ شخص کتنا ہی مخلص اور محنتی ہو لیکن وہ تین ہی کام کر سکے گا' کیونکہ اس کے آگے کے کام اس کو یاد ہی نہیں۔ اس صورت حال کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ اپنے مالک کی نظر میں نکما قرار پائے گا۔ یہی خطرہ ہم مسلمانوں کے ساتھ بھی ہے۔ اگر دینی فرائض کا صحیح تصور ہمارے پیشِ نظر نہیں ہوگا تو یہ خدشہ ہے کہ کہیں ہم اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے سامنے جواب دہی کے وقت ناکام نہ ٹھہریں۔

دین کے فرائض دراصل اعمالِ صالحہ ہی ہیں۔ اِن فرائض کو ایک سہ منزلہ عمارت کی تمثیل سے سمجھا جا سکتا ہے۔ ایک ایسی عمارت کے بارے میں سوچیے جس کی ایک بنیاد اور

تین منزلیں ہوں۔ پہلی منزل پر چار ستون ہوں جن پر چھت تعمیر کی گئی ہے۔ یہ ستون دوسری اور تیسری منزل تک بھی گئے ہوئے ہیں۔ دوسری منزل اور تیسری منزل کی چھت بھی بنی ہوئی ہے۔ بنیاد کا اصل حصہ تو زیر زمین ہوتا ہے جو نظر نہیں آتا' لیکن کچھ سطح نظر بھی آ رہی ہوتی ہے جس کو plinth کہتے ہیں۔ عمارت کی پائیداری کا دارومدار بنیاد پر ہوتا ہے۔ اس عمارت کی اہم ترین منزل پہلی ہے جبکہ دوسری بلند اور تیسری بلند ترین ہے۔ اب اسلام کی اس عمارت کے حوالہ سے دینی فرائض کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بنیاد دراصل ایمان ہے جس کے دو حصے ہیں:

(i) تصدیق بالقلب جو کہ نظر نہیں آتا۔ جیسے عمارت کی اصل بنیاد زمین کے اندر چھپی ہوتی ہے' اسی طرح اصل ایمان دل میں چھپا ہوتا ہے۔

(ii) بنیاد کا ایک حصہ نظر آتا ہے' اسی طرح ایمان کا جو حصہ ظاہر ہے' وہ اقرار باللسان ہے یعنی کلمہ شہادت۔

چار ستون ہماری چاروں عبادات ہیں یعنی نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ۔

پہلی چھت انفرادی طور پر اللہ کی ہمہ تن بندگی کرنا' اسلام میں داخل ہونا' اللہ کا ہمہ وقت غلام بننا ہے۔ اس کے لیے اصطلاحات درج ذیل ہیں:

(i) اسلام: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً ۪﴾ (البقرۃ:۲۰۸) ۔ اسلام سے مراد کلیتاً گردن جھکا دینا' سرِ تسلیم خم کر دینا' submit کرنا' surrender کرنا ہے۔

(ii) اطاعت: ﴿اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ﴾ (النساء:۵۹) ۔ اطاعت سے مراد دلی آمادگی کے ساتھ حکم ماننا ہے۔

(iii) تقویٰ: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ﴾ (آل عمران:۱۰۲) ۔ تقویٰ سے مراد اللہ کے احکام کو توڑنے سے بچنا ہے۔

(iv) عبادت: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ۝۵۶﴾ (الذّٰریٰت) ۔ عبادتِ ربّ سے مراد اللہ تعالیٰ کی مکمل غلامی ہے' یعنی محبت کے جذبہ کے ساتھ

ہمہ وقت‘ ہمہ تن‘ ہمہ وجوہ اللہ تعالیٰ کا بندہ بن جانا۔

عبادت کا لفظ عبد سے بنا ہے‘ جس کا مطلب غلام ہے۔ غلام اور ملازم میں فرق ہوتا ہے۔ ملازمت ہمہ وقتی نہیں ہوتی۔ ملازم کو جس کام کے لیے رکھا جائے‘ اس کے علاوہ وہ کوئی اور کام کرنے کا پابند نہیں ہوتا۔ ریاست کے آزاد شہری کی حیثیت سے مالک کی طرح وہ بھی ایک ووٹ دینے کا حق رکھتا ہے۔ اس کے برعکس‘ غلامی ہمہ وقتی ہوتی ہے۔ غلام کو جو بھی حکم دیا جائے‘ وہ اسے ماننے پر مجبور ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے آقا کی ملکیت میں ہے۔ اسی حالت کو عبد کہتے ہیں اور اسی سے عبادت کا لفظ نکلا ہے۔ انسان کی غرضِ تخلیق‘ اس کا مقصدِ وجود ہی عبادت یا بندگیٔ ربّ ہے۔ شیخ سعدیؒ نے ایک شعر میں کہا:

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی‘ شرمندگی!

جزوی اطاعت نامقبول ہے

اس حوالہ سے ایک بہت اہم نکتہ جو آج مسلمانوں کی نظروں سے اوجھل ہے‘ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بندہ سے کُلّی اطاعت مطلوب ہے۔ یہ بندگی جزوی نہیں بلکہ کُلّی ہونی چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ کچھ احکامات قبول کر لیے جائیں اور کچھ کو رَد کر دیا جائے۔ کچھ سر آنکھوں پر اور کچھ پاؤں تلے رکھ دیے جائیں۔ یہ طرزِ عمل اللہ کے ساتھ تمسخر‘ استہزاء‘ ڈھٹائی اور مذاق اُڑانے جیسا ہے۔ اس کیفیت میں اللہ تعالیٰ کا جو حکم مانا جا رہا ہوتا ہے‘ وہ بھی درحقیقت اللہ کے حکم کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے نفس کی پسندیدگی کی وجہ سے۔ گویا اصل اطاعت اپنے نفس ہی کی ہو رہی ہوتی ہے۔ سورۃ البقرہ میں ارشاد ہوا:

﴿ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝۸۵ ﴾

’’کیا تم کتاب (شریعت) کے ایک حصہ کو مانتے ہو اور ایک کا انکار کرتے ہو؟ سو تم میں سے جو کوئی ایسا کرے تو اس کی سزا دنیا کی زندگی میں رسوائی کے سوا کچھ نہیں‘ اور قیامت کے دن وہ شدید ترین عذاب کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ اور

اللہ اس سے غافل نہیں جو تم عمل کرتے ہو۔‘‘

سود بھی اللہ ہی نے حرام کیا اور سؤر بھی اُسی نے حرام کیا ہے لیکن اس بات کے لیے کیا منطقی دلیل ہوگی کہ اگر سؤر تو نہیں کھایا جا رہا ہو لیکن سود کھایا جا رہا ہو۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بتائی گئی حرمت کی وجہ سے سؤر کو چھوڑا جا رہا ہے تو سمجھنا چاہیے کہ سود کی حرمت تو اللہ کے نزدیک سؤر کی حرمت سے کئی گنا زیادہ ہے۔ سود کے گناہ کو قرآن مجید میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے ساتھ جنگ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں سود کے گناہ کے ستر حصے بتائے گئے ہیں‘ جن میں سے سب سے کم یہ ہے کہ کوئی شخص اپنی ماں سے زنا کرے۔ پس بندگیٔ ربّ کی پہلی منزل پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی مکمل فرماں برداری کرنا آسان نہیں ہے۔ اسی لیے علامہ اقبال نے فرمایا تھا: ؎

چو می گویم مسلمانم بہ لرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا اِلٰہ را!

’’میں جب کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو مجھ پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے‘ کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ لا الٰہ اِلّا اللہ کہنے کے کیا تقاضے ہیں۔‘‘

عبادات پر مبنی تربیتی پروگرام

بہرحال‘ اللہ تعالیٰ نے اس پہلی منزل کی دشواریوں کو آسان کرنے کے لیے ہمیں عبادات کا تحفہ دیا تاکہ ہمارے لیے سہولت ہو سکے۔ سب سے پہلے پانچ وقت کی نماز فرض کی گئی تاکہ انسان اپنی روزمرہ کی مصروفیات سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے سامنے حاضری دے۔ یوں اس کی غفلت دور ہوگی اور نماز کی ہر رکعت میں اللہ سے بندگی کا عہد ﴿اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَاِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ ۝﴾ تازہ ہوتا رہے گا۔ حفیظ جالندھری کا بہت پیارا شعر ہے: ؎

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں‘ لوحِ جبیں تازہ کریں!

نفسانی خواہشات بندگیٔ ربّ میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ نفس کے حملوں سے مقابلہ

کرنے کے لیے روزہ کی عبادت دی گئی۔ اسے ڈھال بنایا گیا۔ روزہ کی حالت میں بندہ کو حلال چیزوں سے رُکنے کی مشق کرائی جاتی ہے تاکہ بقیہ گیارہ مہینے انسان آسانی کے ساتھ حرام سے بچ سکے۔ اللہ کی بندگی میں ایک بہت بڑی رکاوٹ مال کی محبت ہے۔ دل سے حُبِّ مال کھرچنے کے لیے زکوٰۃ کی عبادت رکھی گئی۔ حج میں نماز وطواف بھی ہے' زکوٰۃ کی طرح مال بھی خرچ ہوتا ہے' روزہ کی طرح احرام کی پابندیاں ہیں۔ سو حج ایک ایسی جامع عبادت ہے جس میں نماز' روزہ' زکوٰۃ سے مشابہت ہے اور ان تمام کی برکات کو یہاں جمع کر دیا گیا ہے۔

یہ تمام عبادات بندۂ مؤمن کو بطور تربیتی پروگرام (training course) دی گئی ہیں تاکہ اُسے اللہ تعالیٰ کی ہمہ تن بندگی کی عادت ہو سکے۔ اس کے اندر اللہ کا فرماں بردار بندہ بننے کی صلاحیت واقعتاً پیدا ہو جائے۔ اس عمارت میں ستون اور چھت کا تعلق بہت اہم ہے۔ اگر محض چار ستون کھڑے ہوں اور چھت نہ ہو تو ان کی کوئی افادیت نہ ہو سکے گی۔ بالکل یہی حال اُن لوگوں کا ہے جنہوں نے صرف نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج کو تو اپنایا ہوا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے دیگر حرام وحلال کی فکر ہی نہیں۔ پوری زندگی میں اللہ تعالیٰ کی مکمل بندگی ان کے پیشِ نظر ہے ہی نہیں۔ اسی کی دوسری شکل بھی یکساں طور پر غلط ہے کہ ستون کے بغیر چھت بنانے کی کوشش کی جا رہی ہو۔ بندگیٔ رب کی چھت تعمیر ہی نہیں ہو سکتی جب تک عبادات کے ستون کھڑے نہ ہوں اور اس پر پہلی چھت عبادت' تقویٰ' اطاعت' اسلام کی ہوگی۔

فریضۂ شہادت علی الناس

دوسری چھت جو عملِ صالح کی دوسری منزل ہے' اس کے لیے قرآن حکیم میں دعوت' تبلیغ' تعلیم' نصیحت' وعظ' انذار' تبشیر' تذکیر' امر بالمعروف ونہی عن المنکر' تواصی بالحق اور سب سے جامع اصطلاح شہادت علی الناس کی استعمال ہوئی ہے۔ اس سے مراد لوگوں پر حُجّت قائم کر دینا ہے۔ اس بات کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ہوگا کہ رسولوں کو بھیجنے کا کیا مقصد تھا! رسالت کا سلسلہ کیوں ختم کر دیا گیا؟ اگر رسالت کا کوئی مقصد تھا تو آیا وہ ختم ہو گیا؟

بصورت دیگر، رسالت ختم ہونے کی صورت میں وہ مقصد کیسے پورا ہو سکے گا؟ سب سے پہلے سوال کا جواب سورۃ النساء میں یوں بتایا گیا:

﴿رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ الرُّسُلِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۱۶۵﴾

''ہم نے رسولوں کو خوش خبری دینے والا اور خبردار کرنے والا بنا کر بھیجا تا کہ رسولوں کے آنے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلہ میں کوئی حُجّت باقی نہ رہ جائے۔ اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔''

اگر رسالت کا سلسلہ جاری نہ کیا گیا ہوتا تو پھر کسی بھی حکم کے حوالہ سے اللہ تعالیٰ کی جانب سے پوچھ گچھ پر بندہ یہ کہہ دیتا: اے اللہ! تُو نے ہمیں بتایا ہی نہ تھا۔ اس طرح لوگوں کے پاس ایک دلیل آجاتی۔ اگر بالفرض رسول اللہ تعالیٰ کا بھیجا ہوا کوئی حکم کسی مصلحت کی وجہ سے چھپا لیتے تو لوگ بریُ الذّمہ ہو جاتے اور معاذ اللہ وبال رسول پر آجاتا۔ اب صورتِ حال یہ ہے کہ رسول تو سب کچھ پہنچا کر گئے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کی عدالت میں وہ تو یقیناً بریُ الذّمہ ہوں گے لیکن ہم سے ہماری بداعمالیوں کی پوچھ ہوگی۔ اگر رسالت کا سلسلہ جاری نہ ہوتا یا رسول احکامِ الٰہی پوری طرح پہنچانے کا فریضہ انجام نہ دیتے تو لوگوں کے پاس بداعمالیوں کی دلیل ہو سکتی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسانوں پر آخری حد تک حُجّت قائم کر دی گئی۔ یہی اتمامِ حُجّت ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے انسانوں ہی میں سے رسول بنا کر بھیجے۔ کفارِ مکہ تو یہی کہتے تھے کہ اللہ نے کسی فرشتہ کو رسول بنا کر کیوں نہیں بھیجا! ہمارے جیسے انسان ہی کو رسول کیوں بنایا؟ اللہ تعالیٰ نے انسان کو رسول بنا کر اس لیے بھیجا تا کہ انسانوں پر انسان ہی حُجّت قائم کرے۔ حُجّت صرف قول ہی سے نہیں بلکہ عمل سے بھی ہوتی ہے۔ سچ بولنے کی تلقین تو ہر کوئی کر لیتا ہے مگر ہر حال میں خود سچ بول کر دکھانے ہی سے حُجّت قائم ہو سکتی ہے۔ یہ کہنا تو آسان ہے کہ اللہ کی بندگی کے سوا کسی کی بندگی نہ کرو، لیکن یہ کہنا کہ میں صرف اللہ کا بندہ ہوں، بہت مشکل ہے۔ پس رسالت کا مقصد انسانیت پر حُجّت قائم کرنا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ انسان ابھی تک موجود ہیں تو رسالت کا سلسلہ کیوں ختم ہو گیا؟ اسی بات کو غلام احمد قادیانی نے غلط پیرائے میں لوگوں کے سامنے رکھا کہ نبوت تو رحمت تھی اور انسان ابھی باقی ہیں تو انسانوں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت کا سلسلہ کیسے ختم ہو سکتا ہے! یہ بات سامنے رکھنے کے بعد ہی اس نے اپنی نبوت کا دعویٰ کیا۔ یہ تمہید اتنی وزنی تھی کہ بڑے بڑے لوگ اس کی باتوں میں آ گئے۔ اس سوال کا درست جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہدایت کے سلسلہ کو کامل کر دیا اور خود اس کی حفاظت کا ذمہ بھی لیا۔ اب اس ہدایت کی دعوت وتبلیغ کا فریضہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمّت کو منتقل فرما دیا۔ انبیاء کرام علیہم السلام کو مبعوث کیے جانے کا سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا جبکہ انسان کی ذہنی استعداد اتنی نہیں ہوئی تھی کہ اس کو کامل ہدایت دی جا سکے۔ ابتدائی دور میں نوعِ انسانی تدریجاً ارتقائی مراحل طے کر رہی تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے حواریوں سے فرمایا تھا:

''مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے' مگر ابھی تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ روحِ حق (Spirit of Truth) آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا۔'' (انجیل یوحنا' باب ۱۶' آیت ۱۲)

دراصل تورات ابتدائی دور کے لیے ہدایت نامہ تھی' انجیل درمیانہ عرصہ کے لیے' جبکہ قرآن حکیم ابدی اور کامل ہدایت نامہ کی صورت میں نازل کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ تورات اور انجیل میں تو تحریف ہوئی لیکن قرآن حکیم چونکہ ابدی اور کامل ہدایت نامہ ہے' اس لیے اسے محفوظ کر دیا گیا۔ تا قیامِ قیامت ہدایت کامل ہو گئی۔ وحی کی کھڑکی بند کر دی گئی' اب اس میں کوئی تحریف ممکن نہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اُمّت تک پہنچا دیا اور اب اُمّت کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو ہر ہر انسان تک پہنچائے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گی تو عدالتِ خداوندی میں لوگوں کی گمراہی کی ذمہ دار ٹھہرے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ناقابلِ تصور مشقتیں برداشت کی ہیں۔ شعب ابی طالب کی گھاٹی میں تین سال کی محصوری' یومِ طائف' غارِ ثور' میدانِ بدر' یومِ اُحد' غزوۂ احزاب اور بہت کچھ' لیکن ۲۳ برس کی اس محنتِ شاقہ کے نتیجہ میں عرب سے کفر وشرک کا خاتمہ ہو گیا۔ بالفاظِ قرآنی: ﴿وَقُلْ جَآءَ

الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبَاطِلُ ؕ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ﴿۸۱﴾ (بنی اسرائیل) ''آپؐ کہہ دیجیے: حق آ گیا اور باطل بھاگ گیا۔ بے شک باطل کو بھاگنا ہی تھا۔'' حجۃ الوداع کے موقع پر تقریباً سوا لاکھ کلمہ گو کے مجمع سے رسول اللہ ﷺ نے خطبہ ارشاد فرمایا۔ آخر میں آپ ﷺ نے تین مرتبہ یہ سوال کیا: ''لوگو! کیا میں نے پہنچا دیا؟'' مجمع نے ہر بار یہی جواب دیا: اِنَّا نَشْهَدُ اَنَّکَ قَدْ بَلَّغْتَ الرِّسَالَةَ وَ اَدَّيْتَ الْاَمَانَةَ وَ نَصَحْتَ الْاُمَّةَ وَ كَشَفْتَ الْغُمَّةَ ''ہاں ہم گواہ ہیں' آپ ﷺ نے رسالت کی ادائیگی کا حق ادا کر دیا' امانت ہم تک پہنچا دی' خیر خواہی کا حق ادا کر دیا اور گمراہی کے اندھیروں کے پردے کو چاک کر دیا۔'' اس کے بعد آپ ﷺ نے تین بار آسمان کی جانب انگلی مبارک اُٹھا کر اشارہ کیا: اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ ''اے اللہ! تُو گواہ رہ۔'' پھر سبک دوشی کے احساس کے ساتھ فرمایا: فَلْيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ ''پس پہنچائے وہ جو یہاں موجود ہے' اُن کو جو یہاں موجود نہیں۔'' رسول اللہ ﷺ نے یہ فریضہ عرب کی حد تک تو بنفسِ نفیس مکمل فرمایا لیکن پوری نوعِ انسانی تک اللہ تعالیٰ کے پیغام کو پہنچانے کا بوجھ اُمّت کے کاندھوں پر منتقل کر دیا گیا۔ سورۃ الحج کے آخر میں ارشاد ہوا: ﴿وَجَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ﴾ (آیت ۷۸) ''اللہ کے لیے محنت کرو جیسا کہ محنت کا حق ہے۔'' یہ بھی فرمایا گیا: ﴿لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَ تَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ ۚ﴾ (آیت ۷۸) ''تاکہ رسول تم پر گواہ ہوں اور تم تمام انسانیت پر گواہ ہو جاؤ۔'' انفرادی طور پر بھی ہم سے اللہ کی بندگی کے حوالہ سے جواب دہی ہونی ہے اور پھر لوگوں تک پہنچانے کے بارے میں بھی مسئولیت ہوگی۔ اگر یہ ذمہ داری ادا کرنے میں کوتاہی ہوئی تو لوگوں کی گمراہی کا وبال ہم پر ہوگا۔ قرآن حکیم میں اہم مضمون دو مرتبہ ضرور آتا ہے' تو اسی بات کو سورۃ البقرہ میں دُہرایا گیا: ﴿وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَ يَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ﴾ (آیت ۱۴۳) ''اور اسی طرح ہم نے تمہیں بہترین اُمّت بنایا تاکہ تم پوری نوعِ انسانی پر گواہ بنو اور رسول (ﷺ) تم پر گواہ ہوں۔''

ختمِ نبوت کالازمی تقاضا

یہ ہماری عملی ذمہ داری کی دوسری سطح ہے جو کہ اُمت کے ہر فرد پر فرض کی گئی ہے۔ ختمِ نبوت کالازمی تقاضا یہ ہے کہ وہ دین کی تعلیمات کی تبلیغ‘ نشرواشاعت‘ لوگوں پر اتمامِ حُجّت کی ذمہ داری انجام دے۔ اگر اُمّت یہ فریضہ سرانجام دے گی تو سُرخرو ہوگی‘ ورنہ لوگوں کی گمراہی کا وبال بھی اس کے کاندھوں پر آئے گا۔ یہ بات ایک سادہ سی مثال سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ آپ نے کسی شخص (پیغام رساں) کے ذریعہ اپنے کسی عزیز تک یہ پیغام بھجوایا کہ فلاں کام کل شام تک کردینا ورنہ میرا بڑا نقصان ہو جائے گا۔ فرض کریں وہ کام نہیں ہو سکا تو آپ اپنے عزیز سے اس کا شکوہ کرتے ہیں۔ وہ جواب میں اگر یہ کہہ دے کہ مجھے تو آپ کا کوئی پیغام ملا ہی نہیں‘ تو ظاہر ہے کہ اب آپ اس کو کچھ کہہ ہی نہیں سکتے۔ اب تو آپ اس شخص پر غصہ کریں گے جس کو پیغام پہنچانے کی ذمہ داری دی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے رسول کے ذریعہ پوری نوعِ انسانی کے نام اپنا پیغام بھیجا۔ چنانچہ سورۃ المائدہ میں یہ بات فرمائی گئی: ﴿يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ ۖ وَإِنْ لَمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهُ ۚ﴾ (آیت ۶۷) ’’اے رسول! پہنچا دیجیے جو کچھ آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نازل کیا گیا‘ پھر اگر (بالفرض) آپ نے ایسا نہ کیا تو رسالت کا حق ادا نہیں کیا۔‘‘ اسی طرح سورۃ الاعراف میں بھی اُصول بتا دیا گیا: ﴿فَلَنَسْأَلَنَّ الَّذِينَ أُرْسِلَ إِلَيْهِمْ وَلَنَسْأَلَنَّ الْمُرْسَلِينَ ۝﴾ ’’ہم ان سے بھی پوچھ کر رہیں گے جن کی طرف رسولوں کو بھیجا اور ہم رسولوں سے بھی پوچھ کر رہیں گے۔‘‘ ہر رسول نے اپنی اپنی اُمّت کو یہ پیغام پہنچا دیا‘ اس لیے وہ اللہ تعالیٰ کے حضور بَری ہوگئے۔ ظاہر ہے کہ اب اس حوالہ سے مسئولیت تو اُمّت ہی سے ہوگی۔ ختمِ نبوت کے بعد یہ ذمہ داری اجتماعی طور پر پوری اُمّتِ محمد ﷺ کے حوالہ کر دی گئی ہے۔ اس اُمّت میں مَیں اور آپ دونوں شامل ہیں۔ اگر مَیں اپنے آپ کو اور آپ اپنے آپ کو اس سے فارغ سمجھ لیں گے تو یہ ذمہ داری کون ادا کرے گا؟ اب رسول تو بھیجے نہیں جائیں گے۔

دینی فرائض کی اس دوسری منزل‘ دعوت وتبلیغ کی سطح پر بھی عبادات مددگار ہوتی ہیں‘

جیسا کہ سورۃ البقرہ میں فرمایا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ﴾ (آیت ۱۵۳) ''اے ایمان والو! صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔'' نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ پہلی منزل ''بندگیٔ ربّ'' کے لیے سہارا ہیں اور دعوت و تبلیغ کے لیے بھی انہی سے قوت حاصل ہوگی۔

فریضہ اقامتِ دین

تیسری منزل سب سے اہم، سب سے کٹھن، سب سے بلند ہے۔ کسی بھی عمارت کی اہم ترین منزل تو پہلی ہوتی ہے لیکن اونچی منزل بلند ترین ہوتی ہے۔ سب سے اونچی منزل کا تقاضا صرف یہی نہیں ہے کہ دین کی تعلیمات دوسروں تک پہنچا دی جائیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے نظام کو بالفعل غالب و قائم کر کے دکھایا جائے۔ اُسی کے نام کا بول بالا ہو۔ اسی کا قانون معاشرہ میں جاری و رائج ہو۔ شریعت کو نافذ کیا جائے۔

اس کے لیے قرآن حکیم میں چار اصطلاحات استعمال ہوئی ہیں:

(i) تکبیرِ ربّ: سورۃ المدثر میں ارشاد ہوا: ﴿یٰٓاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝۱ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝۲ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝۳﴾ ''اے چادر اوڑھنے والے! کھڑے ہو جاؤ اور خبردار کرو۔ اور اپنے رب کی بڑائی کرو۔'' تکبیر کا مطلب محض ''اللہ اکبر'' کہہ دینا نہیں بلکہ اس سے مراد بڑا کرنا ہے۔ اللہ یقیناً بڑا ہے لیکن اس کی بڑائی تسلیم نہیں کی جا رہی ہے۔ زندگی کے معاملات میں اس کی بڑائی نافذ نظر نہیں آتی۔ مثلاً چور کے لیے حکم ہے کہ اس کا ہاتھ کاٹا جائے، لیکن اگر عدالت میں ہاتھ کاٹنے کے بجائے کسی دوسرے قانون پر عمل ہو رہا ہو تو اللہ کا قانون چھوٹا ہو گیا اور دوسرا قانون بڑا ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ کے قانون کے چھوٹے ہونے کا مطلب، نعوذ باللہ، یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کو چھوٹا سمجھا جا رہا ہے جبکہ قرآن میں کہا جا رہا ہے کہ اللہ کو بڑا کرو! یعنی وہ نظام قائم کرو جہاں اُس کی بڑائی مسلّم ہو۔ کوئی گوشہ ایسا نہ رہ جائے جہاں اُس کی بڑائی نافذ نہ ہو۔ اسی طرح اگر پارلیمنٹ میں یہ طے ہو کہ اللہ تعالیٰ کے احکامات کے خلاف کوئی قانون سازی نہیں کی جائے گی تب تو اللہ کی بڑائی ہوئی لیکن اگر اکثریتی رائے پر مبنی قانون بنا دیا جائے تو ایسے میں اللہ بڑا نہیں ٹھہرا بلکہ دراصل بڑائی جمہور کی ہو گئی۔

سورۂ بنی اسرائیل کی آخری آیت میں فرمایا گیا:

﴿وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ﴿۱۱۱﴾﴾

''اور کہہ دیجیے کہ تمام تعریف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے جس نے کوئی اولاد نہیں بنائی' اور نہ ہی اس کی بادشاہی میں کوئی شریک ہے' اور نہ ہی اس کا کوئی دوست ہے کمزوری کی وجہ سے' اور اُس کی بڑائی بیان کرو جیسا کہ تکبیر کرنے کا حق ہے۔''

علامہ اقبال نے یوں فرمایا:؎

یا وسعتِ افلاک میں تکبیرِ مسلسل
یا خاک کے آغوش میں تسبیح و مناجات
وہ مذہبِ مردانِ خودآگاہ و خدامست
یہ مذہبِ ملا و جمادات و نباتات

اور:؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
مُلّا کی اذاں اور' مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اِسی ایک فضا میں
کرگس کا جہاں اور ہے' شاہیں کا جہاں اور!

(ii) اقامتِ دین: سورۃ الشوریٰ میں ارشاد ہوا: ﴿اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ؕ﴾ (آیت ۱۳) ''دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔'' مسلمانوں کو دین اس لیے نہیں دیا گیا کہ دین پامال و مغلوب ہو اور وہ بے حس ہو جائیں۔ مولانا حالیؒ نے اسی کیفیت پر کہا تھا:؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے!

بندۂ مومن کی غیرت کیسے نہیں جاگتی جب کہ دین پامال ہو رہا ہو! اغیار اسے پاؤں تلے روندرہے ہوں تو اللہ کا وفادار بندہ کیسے پاؤں پھیلا کر سوتا رہ سکتا ہے! بال بچوں میں خوش و خرم زندگی بسر کرتا ہوا۔ یہ دین تو قائم ہونے کے لیے آیا ہے۔ اسی لیے اقامتِ دین کا حکم دیا جا رہا ہے۔

(iii) اِظہارِ دین: یہ اصطلاح قرآن حکیم میں تین بار آئی ہے؛ سورۃ الصّف، سورۃ الفتح اور سورۃ التوبہ میں۔

﴿هُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّیْنِ كُلِّهٖ﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے اپنے رسول کو بھیجا الہدیٰ (قرآن حکیم) اور دینِ حق دے کر تا کہ اسے کُل کے کُل دین پر غالب کرے۔''

اظہار کے لفظی معنی غلبہ کے ہیں۔ اِظہارِ دین سے مراد یہ ہے کہ پورے نظامِ زندگی پر اللہ کا دین غالب ہو جائے، زندگی کا کوئی حصہ خالی نہ رہے۔

(iv) یکون الدین کلّہ للہ: یہ اصطلاح سورۃ البقرۃ اور سورۃ الانفال میں آئی ہے:

﴿وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ لِلّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ: ۱۹۳)

''اور لڑو ان سے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کا ہو جائے۔''

﴿وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّیَكُوْنَ الدِّیْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ﴾ (الانفال: ۳۹)

''اور جنگ کرو ان (اللہ کے دشمنوں) سے یہاں تک کہ فتنہ (فساد) دور ہو جائے اور دین کُل کا کُل صرف اللہ کے لیے ہو جائے۔''

اصل فتنہ یہ ہے کہ اللہ کی زمین پر اللہ کی حکومت کے بجائے کوئی اور اپنا قانون چلانے کی کوشش کرے تو درحقیقت وہ اللہ تعالیٰ کا باغی ہوا، جب کہ Allah is the rightful ruler of the world، سو اللہ تعالیٰ کے وفادار کی یہ ذمہ داری ہوگی کہ وہ ایسی بغاوت سے نبرد آزما ہو کر اس کا سر کچلنے کی کوشش کرے، ورنہ وہ بھی باغی کا ساتھی شمار ہوگا۔ اگر کوئی ایک شخص یہ کہے کہ دنیا میں صرف میرے پاس پورا اختیار ہے کہ وہ جو چاہے سو کرے، تو یہ دعویٰ فرعون اور نمرود نے کیا تھا۔ اگر تمام انسان مل کر جمہوریت کی شکل میں یہ کہیں کہ زمین

ہماری ہے، ہم جو چاہیں قانون نافذ کریں تو اسلام کی نگاہ میں یہ بھی بغاوت ہے۔ غیر اللہ کی حاکمیت کا اصول بغاوت ہے۔ حاکمیت تو صرف اللہ تعالیٰ ہی کی ہونی چاہیے۔ ﴿اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ﴾ (یوسف: ۴۰ و ۶۷) جو اللہ تعالیٰ کا وفادار ہے، اس کا فرض ہے کہ وہ اس بغاوت کا سر کچلنے کے لیے باغی سے نبرد آزما ہو۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو اس کا شمار باغی کے ساتھیوں میں ہوگا کہ وہ بھی جرم کی معاونت کر رہا ہے۔ بقولِ اقبال ؎

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی، باقی بتانِ آزری!

پس اللہ کی بڑائی کا نظام (تکبیرِ رب)، اللہ کے دین کا قیام (اقامتِ دین)، دین کا غلبہ (اِظہارُ دِینِ الحَقِّ)، کُل دین اللہ کا ہو جائے (یَکُونَ الدِّینُ کُلُّهٗ لِلّٰهِ) کی چار اصطلاحات ہیں مگر مفہوم ایک ہی ہے۔ پانچویں اصطلاح لِتَکُونَ کَلِمَةُ اللّٰهِ هِیَ الْعُلْیَا کی ہے جو کہ حدیثِ نبوی میں آئی ہے۔

تبلیغ کے دو انداز

بعض پودے بیل کی شکل میں زمین پر پھیلتے ہیں جب کہ بعض درخت کی صورت میں اوپر چڑھتے ہیں۔ اسی طرح تبلیغ بھی دو طرح کی ہوتی ہے:

مذہبی تبلیغ: یہ محض عقیدہ و عبادات کی تبلیغ ہوتی ہے، جیسے عیسائیت کی تبلیغ، جس کی شریعت ہی ساقط ہے۔ اس لیے قانون نافذ کرنے یا نظام بدلنے کی کوئی بات نہیں ہوتی۔

انقلابی تبلیغ: اس سے مراد نظام کی تبدیلی کی بات ہے۔ دین اسلام میں چونکہ شریعت اور قانون عطا کیا گیا ہے اس لیے نہ صرف اللہ اور رسول ﷺ کے پیغام کو پہنچانا ہے بلکہ اللہ کے دین کے نظام کو قائم بھی کرنا ہے۔

دوسری منزل تبلیغ کی اور تیسری منزل انقلاب کی ہے، یعنی مروجہ نظام کی تبدیلی۔ اگر کوئی بادشاہ خود بھی اللہ کے احکام کا پابند ہو اور اس کے قانون کو نافذ کرنے والا بھی ہو، جیسے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام، تو اسے اسلامی بادشاہت کہیں گے، جبکہ فرعون اور نمرود کافرانہ و مشرکانہ بادشاہت کی مثالیں تھے۔ اللہ کی زمین پر اللہ کی حکومت

قائم ہونی چاہیے اور قرآن وسُنّت کے مطابق شریعت نافذ کی جائے۔ پارلیمنٹ اللہ اور رسول ﷺ کے احکامات کے دائرہ کے اندر اندر قانون سازی کر سکتی ہے۔ اکثریت کے فیصلہ کو اُس وقت تسلیم کیا جائے جب اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہ ہو رہی ہو۔ یہ اسلامی جمہوریت کہلائے گی جو کہ تمدن کی ترقی کے ساتھ قابلِ قبول ہے' لیکن اس میں یہ بات طے ہوگی کہ پارلیمنٹ کی قانون سازی کا اختیار محدود ہو۔ پاکستان کے دستور میں یہ الفاظ تو موجود ہیں:

"No legislation will be done repungnant to the Quran and the Sunnah."

لیکن ہماری بدقسمتی ہے کہ اس کو عملی لحاظ سے نافذ نہیں کیا گیا' حالاں کہ پاکستان بنانے کا مقصد ہی یہ تھا کہ ایک ایسا ملک حاصل کیا جائے جہاں اسلام کے اصولِ حریت واخوت و مساوات کا نمونہ دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ ہمارا جرم یہی ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں جس کی وجہ سے عصبیتیں اور اختلافات پروان چڑھے۔

بہرحال' ہر مسلمان کو جان لینا چاہیے کہ ہم پر عائد دینی ذمہ داریوں کی مثال ایک سہ منزلہ عمارت جیسی ہے۔ بنیاد ایمان ویقین کی ہے' جس کی نظر آنے والی سطح کلمہ شہادت لا الٰہ اِلّا اللہ ہے جبکہ اس عمارت کے چار ستون نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ ہیں۔

پہلی منزل کی چھت کے لیے اسلام' اطاعت' تقویٰ' عبادت کی اصطلاحات ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو کُلی عبادت مطلوب ہے' جزوی نہیں۔ ہمہ تن' ہمہ وقت' ہمہ وجوہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنا پہلی منزل ہے۔

دوسری منزل دعوت وتبلیغ کی ہے۔ دین کی تعلیمات کو پہنچانا' خلقِ خدا پر حُجّت قائم کرنا ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آج اُمّت خود محتاج ہوگئی ہے کہ اس کو ہی دین کی تعلیمات بتائی جائیں بجائے یہ کہ اُمّت دوسروں کو پہنچائے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ پہلے اُمّت کے اندر اسلام کو دوبارہ زندہ کرنے کی لہر پیدا کی جائے۔

تیسری منزل دعوت وتبلیغ' امر بالمعروف ونہی عن المنکر سے آگے بڑھ کر اللہ کے دین کو غالب کرنا' اس کو قائم کرنا' اللہ کی بڑائی کا نظام نافذ کرنا' اللہ کے کلمہ کو سربلند کرنا'

پورے کے پورے دین کو عملاً اللہ ہی کے لیے کرنے کے لیے جدّ و جُہد کرنا ہے۔

جہاد کے مراحل و مدارج

اب ان دینی فرائض کی تین منزلوں کا جہاد سے تعلق سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جہاد کا لفظ جُہد سے نکلا ہے۔ جُہد کوشش کو کہتے ہیں۔ دنیا میں ہر کوشش کا مقابلہ دوسری کوشش سے ہو رہا ہے۔ کوشش میں جب مقابلہ کا عنصر پیدا ہو جائے تو وہ جُہد سے جہاد بن جاتی ہے۔ گویا یک طرفہ کوشش جُہد ہے اور کوشش کا کوشش سے ٹکراؤ یعنی کشاکش ہونا جہاد ہے۔ مثال کے طور پر قتل یک طرفہ عمل ہے، کوئی شخص گزر رہا تھا اور اس کو کسی دوسرے نے قتل کر دیا، جبکہ قتال یعنی جنگ میں دو آدمی ایک دوسرے کو مارنے کے لیے آمنے سامنے ہوتے ہیں۔

(i) نفس کے خلاف جہاد: یہ جہاد بندگی کے ہر مرحلہ پر ہے۔ ذاتی سطح پر اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے کے لیے تین مقابلے لازماً کرنے پڑتے ہیں۔ رب کی بندگی کے لیے سب سے پہلے اپنے نفس سے مقابلہ کرنا ہے۔ فجر کی اذان کی آواز سے ہی اس کا آغاز ہو جاتا ہے۔ اگر نفس کے تقاضوں کو دبانے کی صلاحیت ہوگی تب ہی اللہ کی فرماں برداری ممکن ہے۔ گویا بندگیٔ ربّ کے لیے سب سے پہلا جہاد نفس سے ہی کرنا ہوگا۔ اسی لیے جب رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا: سب سے افضل جہاد کون سا ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَن تُجَاهِدَ نَفْسَكَ وَ هَوَاكَ فِيْ ذَاتِ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ))[سلسلة الاحاديث الصحيحة: ۲۰۷۱] ''اپنے نفس اور اپنی خواہشات کو اللہ کا مطیع بنانے کے لیے جہاد کرنا۔'' غزوۂ تبوک سے واپسی پر حضور ﷺ نے فرمایا تھا: ''اب ہم جہادِ اصغر سے جہادِ اکبر (نفس سے جہاد) کی جانب جا رہے ہیں۔'' نفس کو اُکسانے والا شیطانِ لعین بھی موجود ہے۔ ﴿الَّذِیْ یُوَسْوِسُ فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ ۝۵﴾ (الناس) وہ انسانوں کے سینوں میں پھونکیں مارتا ہے، اشتعال پیدا کرتا ہے، برائیوں کو مزین کر کے دِکھاتا ہے۔ بے حیائی کو فیشن کا نام دیتا ہے۔ ناچ گانے کو کلچر کا نام دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی بندگی کرنے کے لیے شیطان سے مقابلہ کرنا بھی ضروری ہے۔ تیسرا عنصر بگڑا ہوا معاشرہ ہے جس کا دباؤ بھی انسان پر ہوتا ہے۔ جس طرف ایک ہجوم جا رہا ہو اُسی طرف جانا آسان ہوتا ہے لیکن

ہجوم کے مخالف سمت میں چلنے کے لیے بہت زور لگانا پڑتا ہے۔ جب معاشرہ میں اللہ تعالیٰ کے احکامات کی پرواہی نہ ہو اور ہم اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی فرماں برداری کرنا چاہ رہے ہوں تو لازماً کشمکش ہوگی۔ زیادہ تر لوگ معاشرہ کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں جبکہ دین کے تقاضوں پر عمل کرنے کے لیے زمانہ کی مخالفت برداشت کرنی پڑتی ہے۔ بندۂ مؤمن کو ہمہ وقت صحیح وغلط اور حلال وحرام کی کشمکش کا سامنا رہتا ہے۔ زمانہ کی رَوش اور دین کے تقاضے ٹکرا رہے ہوتے ہیں۔ پس دینی فرائض کی پہلی منزل پر اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بندگی کرنے کے لیے اپنے نفس سے‘ شیطان سے اور معاشرہ کے دباؤ سے لازماً تین جہاد کرنے پڑتے ہیں۔

(ii) جہاد بالقرآن: جہاد فی سبیل اللہ کی دوسری منزل دعوت وتبلیغ کے ضمن میں ہے۔ اللہ کی طرف دعوت‘ توحید کے پیغام کا پرچار‘ نبوت کے پیغام کی اشاعت‘ قرآن حکیم کی تعلیمات کو دلیل سے پیش کرنا‘ اس پہلو سے بھی کھلی فضا ملنا ممکن نہیں۔ اگر اللہ کے دین کی تبلیغ کی جارہی ہے تو دوسرے نظاموں کی بھی تبلیغ ہورہی ہوتی ہے۔ اگر معاشرہ میں توحید کے مبلغ موجود ہیں تو شرک کے پرچارک بھی ہوں گے۔ معاشرہ میں دعوت وتبلیغ کے لیے کوشش کرنی ہوگی‘ زور لگانا ہوگا‘ جگہ بنانی پڑے گی۔ حق اُس وقت تک نہیں پھیلے گا جب تک کہ اُس کے پھیلانے والے نہ ہوں۔ پھیلانے والے اگر اپنی کوشش نہیں لگا رہے ہوں گے تو حق خود بخود نہیں پھیل سکتا۔ دعوت وتبلیغ کی سطح پر جہاد کے لیے بھی جان لگانا‘ وقت کھپانا‘ مال لگانا ضروری ہے۔ یہ کام وعظ وتقریر وتحریر سے بھی کرنا ہے اور جو بھی موجود ذرائع ابلاغ ہوں‘ ان کا استعمال بھی کیا جائے گا۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو اللہ کی بات دب جائے گی‘ شیطانی بات پھیل جائے گی۔ سورۃ الفرقان میں فرمایا گیا: ﴿فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝۵۲﴾ ’’پس آپ اس (قرآن) کے ذریعے ان سے جہاد کیجیے، بہت بڑا جہاد۔‘‘ سورۃ الفرقان مکی سورت ہے۔ اس میں جہاد کا لفظ بطور قتال استعمال نہیں ہوا بلکہ بِہٖ سے مراد قرآن حکیم ہی ہے۔ قرآن حکیم الحاد‘ مادہ پرستی‘ شرک اور دوسری گمراہیوں کے نظریات اور فلسفوں کی جڑ کاٹے گا۔ اس مرحلہ پر غلط خیالات‘

نظریات‘ دلائل اور بُرہان کے لیے قرآن کی تلوار ہے۔

(iii) مسلح تصادم: جہاد فی سبیل اللہ کی بلند ترین منزل اللہ تعالیٰ کے دین کو قائم کرنے‘ اس کے نظام کو غالب کرنے کے لیے جہاد ہے۔ یہ سب سے کٹھن مرحلہ ہے‘ کیونکہ اللہ کے نظام کو غالب کرنے کے لیے پہلے سے موجود نظام کو ہٹانا پڑتا ہے۔ دراصل کوئی دو نظام ایک ساتھ نہیں چل سکتے۔ جو نظام پہلے سے قائم ہو‘ اس میں کچھ لوگوں کے مفادات‘ مسندیں‘ قیادتیں‘ چودھراہٹیں ہوتی ہیں۔ معاشرہ کے جاگیردار‘ زمین دار‘ سرمایہ دار ہوتے ہیں جن کے مفادات مروجہ نظام سے وابستہ ہوتے ہیں۔ اس لیے وہ کبھی بھی اس نظام کو ہٹانا برداشت نہیں کریں گے۔ نتیجتاً اس صورت حال میں جو تصادم ہوگا وہ شدید ترین ہوگا۔ ویسے تو تصادم ہر مرحلہ پر ہے۔ پہلی منزل پر اپنے نفس سے‘ دوسری منزل پر نظریاتی تصادم اور تیسری منزل پر جسمانی تصادم درپیش ہوگا۔ اس منزل پر لوگوں کے مفادات کا معاملہ ہے‘ اس لیے طاقت کا طاقت کے ساتھ ٹکراؤ کی نوبت ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ جو قریش کی آنکھوں کا تارا تھے‘ صادق و امین کا لقب ملنے کے باوجود بھی وہ شدید مخالفت کا شکار ہوئے۔ صرف وعظ و تبلیغ سے بات پھیل تو سکتی ہے مگر غالب نہیں ہوسکتی۔ نظام بدلنے کی بات نہ کرتے تو شاید ان پر زبانی و جسمانی تشدد کا معاملہ نہ ہوتا‘ لیکن ان سے تو علی الاعلان کہلوایا گیا: ﴿وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَیْنَکُمْ ؕ﴾ (الشوریٰ:۱۵)۔ حضرت محمد ﷺ تو ظلم کو ختم کرنے کے لیے ہی انقلابی جدّ و جُہد کر رہے تھے۔ ایسے میں ظالم عناصر یہ سب کیسے برداشت کر سکتے تھے! چنانچہ اس منزل کا آخری مرحلہ یہ ہے کہ جان ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں آیا جائے۔ اس کے بغیر یہ دین غالب و قائم نہیں ہوسکتا۔ میٹھے میٹھے وعظوں‘ ٹھنڈی ٹھنڈی تبلیغ‘ کتابوں کے لکھنے سے بات پھیلے گی لیکن دین غالب نہیں ہوسکے گا۔ اس طرح تبلیغِ دین کا فریضہ تو پورا ہوگا لیکن اقامتِ دین کا فرض ادا نہیں ہوسکے گا۔

منظم جماعت کی ضرورت و اہمیت

اس منزل کے لیے ایک منظم جماعت ناگزیر ہے۔ ایک ڈسپلن والی جماعت کی شکل میں ایسے لوگ ہوں کہ جو حکم سنیں‘ اس کے ماننے والے ہوں اور اس مقصد کے لیے تن‘ من‘

دھن لگانے کے لیے تیار ہوں۔ ایسی جماعت جب تصادم کے مختلف مراحل سے گزر کر سر سے کفن باندھ کر جان دینے کے لیے تیار ہو کر نکلے گی تبھی دین غالب ہو سکے گا۔ اس کے بغیر دنیا میں کوئی انقلاب نہیں آیا۔ کوئی پودا اپنی جگہ نہیں چھوڑتا جب تک اس کو کھینچ کر نکالا نہ جائے۔ کوئی نظام اُس وقت تک نہیں ہٹ سکتا جب تک اس کو اُکھاڑا نہ جائے۔ اس مرحلہ پر جن کے مفادات اس نظام سے وابستہ ہیں‘ وہ اُس کو برقرار رکھنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگائیں گے۔ تصادم کی اِس شکل کا نام قتال ہے‘ یعنی مسلح تصادم (Armed Conflict) جس کا آغاز غزوۂ بدر سے ہوا اور عرب کی حد تک غزوۂ حنین پر ختم ہوا۔ مدنی دور کے چھ سال تک یہ تصادم جاری رہا‘ تب اللہ کا دین غالب ہوا ہے۔ یہ محض تبلیغ سے نہیں ہوا۔ تبلیغ سے جماعت تیار ہوئی۔ تربیت وتزکیہ سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی قوت فراہم ہوئی۔ دعوت وتبلیغ اور تربیت وتزکیہ (بذریعہ قرآن) سے حزب اللہ وجود میں آئی جس نے صبرِ محض‘ اقدام اور مسلح تصادم کے مراحل سے گزر کر‘ اپنی جانیں دے کر اللہ کے دین کو غالب کیا۔ ٹکراؤ اور تصادم (Active Resistance) کے مرحلہ پر آ کر جہاد‘ قتال میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جہاد کی پہلی منزل اپنے نفس سے جہاد‘ دوسری منزل دعوت وتبلیغ کے لیے اپنی جان کھپانا‘ تیسری منزل اقامتِ دین کی جِدّوجُہد میں جان و مال لگانا ہے۔ سورۃ الحجرات میں فرمایا گیا:

﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَ لَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾﴾

’’بدو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے۔ کہہ دیجیے کہ تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو بلکہ یوں کہو کہ ہم مسلمان ہو گئے ہیں اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ لیکن اگر تم اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہو گے تو وہ تمہارے اعمال میں سے کچھ کمی نہیں کرے گا۔ بے شک اللہ بہت بخشنے والا‘ بہت مہربان ہے۔‘‘

اگلی آیت میں بتایا گیا کہ مؤمن کون ہیں:

﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ جٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵﴾

''مؤمن تو بس وہی ہیں جو اللہ اور اُس کے رسول پر ایمان لائیں' پھر شک میں نہ پڑیں اور اللہ کی راہ میں اپنے مالوں اور اپنی جانوں سے جہاد کریں۔ وہی لوگ سچے ہیں۔''

اس سے ایمان اور جہاد فی سبیل اللہ کا تعلق واضح ہو گیا۔ جہاد دراصل شرطِ لازم ہے۔ جہاد ہے تو ایمان ہے' جہاد نہیں ہے تو ایمان نہیں ہے۔ یاد رہے کہ یہ ایمان حقیقی کی بات ہو رہی ہے' ایمانِ قانونی تو اسلام ہے۔

ایک بہت اہم حدیث مسند احمد' جامع ترمذی اور مشکوٰۃ شریف میں موجود ہے۔ حضرت حارث اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((آمُرُكُمْ بِخَمْسٍ، اَللّٰهُ اَمَرَنِيْ بِهِنَّ: بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَ الطَّاعَةِ وَ الْهِجْرَةِ وَ الْجِهَادِ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ))

''میں تمہیں پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں' اللہ نے مجھے ان کا حکم دیا ہے: جماعت کا' سننے اور ماننے کا' ہجرت کا' اور اللہ کی راہ میں جہاد کا۔''

آپ لوگوں نے یہ حدیث پہلی بار سنی ہو گی۔ اِس کی سند کے حوالہ سے جب ایک شیخ الحدیث سے پوچھا گیا تو انہوں نے بھی کہا کہ یہ الفاظ نامانوس سے ہیں۔ اِس کے برعکس اسلام کے پانچ ارکان والی حدیث ہر مسلمان کو یاد ہے۔ دراصل انسانی نفسیات ہے کہ جس چیز پر توجہ ہوتی ہے' انسان کو وہی یاد رہتی ہے۔ اگر توجہ کسی خاص طرف ہو تو سامنے سے گزر جانے والی چیز آنکھیں کھلی ہونے کے باوجود بھی انسان کو نظر نہیں آ رہی ہوتی۔ بعض مرتبہ کسی کتاب کا کئی بار مطالعہ کیا ہوتا ہے لیکن اِس کی کوئی اہم بات نظروں سے پوشیدہ ہی رہتی ہے۔ اسی طرح آج کے مسلمان کو غلبۂ دین کے تقاضے یاد ہی نہیں۔ دینی فرائض کی تیسری منزل تو بالکل ہی نظروں سے اوجھل ہے۔ آج مسلمانوں کے دل و دماغ سے یہ بات محو ہو چکی ہے کہ دین کو قائم کرنا بھی فرض ہے۔ لہٰذا اس کے تقاضوں کو ذہن قبول ہی نہیں کرتا۔ الفاظ پڑھ لیتے ہیں لیکن مفہوم کی جانب توجہ ہی نہیں ہوتی۔ اس

حدیث میں اجتماعیت سے جڑ کر سننے' ماننے اور اللہ کے راستے میں ہجرت و جہاد کے جو تقاضے بتائے جا رہے ہیں' یہ دراصل اقامتِ دین کے لیے لازمی ہیں۔

جہاد کے ساتھ ہجرت کا لفظ بھی آیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سی ہجرت سب سے افضل ہے' تو آپ ﷺ نے فرمایا: ((اَنْ تَهْجُرَ مَا كَرِهَ رَبُّكَ)) [مسند احمد:۶۸۱۳] ''یہ کہ تم ہر اُس شے کو چھوڑ دو جو اللہ کو پسند نہیں۔'' اس نیت کے ساتھ کہ اللہ کرے کہ وہ وقت آئے کہ خالص اللہ کے دین کے غلبہ کی جدّوجُہد میں اپنا گھر بار' اہل وعیال' مال ومتاع حتیٰ کہ اپنے وطن وسرزمین کو بھی چھوڑنا پڑے' یہ ہجرت کا سب سے اونچا درجہ ہوگا۔ جیسے حضرت محمد ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اللہ کے دین کے غلبہ کے لیے سب کچھ چھوڑ کر نکل گئے۔ کسی بھی گناہ کو چھوڑ دینے سے ہجرت کا آغاز تو ہو گیا لیکن نیت چوٹی کی رکھنی چاہیے' جیسا کہ حدیثِ مبارکہ ہے:

((مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ)) (صحیح مسلم:۴۹۳۱)

''جس کو موت آئے اس حال میں کہ نہ تو اُس نے جنگ میں حصہ لیا اور نہ ہی اس کے دل میں اس کی خواہش تھی تو اسے ایک طرح کے نفاق پر موت آئی۔''

خود رسول اللہ کی آرزو تھی کہ ''میری خواہش ہے کہ میں اللہ کی راہ میں جنگ کروں اور قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں' پھر اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں۔'' (صحیح البخاری:۲۷۹۲)

بیعتِ سمع وطاعت

ہجرت کے بعد جہاد کا ذکر آیا ہے' جس کی آخری منزل قتال ہے۔ صحیح بخاری میں بیعتِ جہاد کے حوالہ سے نقل ہے کہ غزوۂ احزاب کے موقع پر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سنگلاخ زمین پر خندق کھودتے ہوئے کہتے جا رہے تھے:

نَحْنُ الَّذِيْنَ بَايَعُوْا مُحَمَّدًا عَلَى الْجِهَادِ مَا بَقِيْنَا اَبَدًا

''ہم وہ لوگ ہیں جنہوں نے محمد ﷺ سے جہاد کی بیعت کی ہے جو کہ اب جاری

رہے گا جب تک جان میں جان ہے۔‘‘

اسی طرح صحیح بخاری و صحیح مسلم دونوں میں بیعتِ سمع و طاعت کے حوالہ سے متفق علیہ حدیث ہے جس کو حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے روایت کیا ہے۔

بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ﷺ عَلَی السَّمْعِ وَ الطَّاعَۃِ فِی الْعُسْرِ وَ الْیُسْرِ، وَ الْمَنْشَطِ وَ الْمَکْرَہِ، وَ عَلٰی اَثَرَۃٍ عَلَیْنَا،وَ عَلٰی اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَھْلَہٗ، وَ عَلٰی اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَیْنَمَا کُنَّا، لَا نَخَافُ فِی اللّٰہِ لَوْمَۃَ لَائِمٍ

’’ہم نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بیعت کی کہ سنیں گے اور اطاعت کریں گے تنگی اور آسانی میں‘ چاہے ہماری طبیعت میں آمادگی ہو یا چاہے ناپسندیدگی ہو‘ خواہ ہم پر دوسروں کو ترجیح دی جائے‘ اور جن کو امیر بنایا جائے اُن سے ہم نہیں جھگڑیں گے‘ اور حق بات ضرور کہیں گے جہاں کہیں بھی ہوں گے‘ اور اللہ کے معاملہ میں کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے۔‘‘

اِن احادیثِ مبارکہ کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے اجتماعیت سے جڑنے کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔ ایسی جماعت جس سے وہ قوت وجود میں آئے جو اقامتِ دین‘ غلبۂ دین‘ اسلامی انقلاب‘ اللہ کی تکبیر بلند کرنے‘ اس کے دین کا بول بالا کرنے‘ اللہ کے نام کے کلمہ کی سربلندی‘ پورے نظام زندگی پر دین اسلام کا غلبہ کرنے کے لیے جدّوجُہد کر رہی ہو۔

پس یہ بات سامنے آ گئی کہ ہمارے دینی فرائض کے تین درجے (levels) ہیں‘ اور ہر درجہ کا جہاد الگ ہے۔ پہلے درجہ پر جہاد مع النفس ہے۔ ساتھ ہی شیطان اور بگڑے معاشرہ سے بھی کشمکش ہوگی۔ دوسرے درجہ پر غلط عقائد و نظریات‘ شرک و الحاد سے مجاہدہ ہے۔ تیسرے درجہ پر باطل کی قوت سے تصادم کی شکل میں جہاد جو کہ قتال کی صورت اختیار کر سکتا ہے۔ سورۃ الصّف میں اللہ کی محبوبیت کا بلند ترین مقام یہی بتایا گیا:

﴿اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِہٖ صَفًّا کَاَنَّھُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۴﴾

’’بے شک اللہ کو محبوب ہیں وہ لوگ جو اُس کی راہ میں لڑتے ہیں سیسہ پلائی دیوار بن کر۔‘‘

دو باتیں ہمارے پیشِ نظر رہنی چاہئیں: فہمِ صحیح اور عملِ صحیح۔ ان نشستوں میں ہم فہمِ صحیح حاصل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دین کے تقاضے ہم پر واضح ہوئے۔ دین کے فرائض کا احساس و شعور ہو۔ دین کی ترجیحات‘ اس کے ستون و عمود سامنے رہیں۔ اس کے بعد اللہ کی توفیق سے انسان عملِ صحیح کا آغاز کرے لیکن نگاہ ہمیشہ اُونچی رکھے۔ ہماری اصل منزل اللہ تعالیٰ کی شانِ کبریائی کا نفاذ ہونا چاہیے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے اُس کی نصرت و عافیت کے ہر وقت طالب ہیں! ❁ ❁ ❁

مسلسل اشاعت کے 60 سال

تنظیمِ اسلامی کا پیغام

بانی تنظیم: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

خلافتِ راشدہ کا نظام

امیر تنظیم: شجاع الدین شیخ

ماہنامہ میثاق لاہور

Online Link
https://meesaq.tanzeemdigitallibrary.com/

تنظیمِ اسلامی www.tanzeem.org

تنظیم اسلامی کا ترجمان ماہنامہ ’’میثاق‘‘ گزشتہ چھ دہائیوں سے تسلسل کے ساتھ شائع ہو رہا ہے اور دینی جرائد کے وسیع حلقے میں اپنی منفرد علمی، فکری اور دعوتی شناخت برقرار رکھے ہوئے ہے۔ ماہنامہ ’’میثاق‘‘ کے مشمولات میں بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ کے فکر و فلسفہ، منہجِ انقلاب نبوی ﷺ اور اسلامی نظامِ حیات کے انفرادی اور اجتماعی تقاضوں کو نمایاں اہمیت حاصل ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ عالمِ اسلام کو درپیش سیاسی، معاشی اور تہذیبی و معاشرتی چیلنجز، قومی و بین الاقوامی حالات و واقعات کا تجزیہ اور اسلامی زاویہ نگاہ سے اُن کی تفہیم اور حل بھی اس کے اہم موضوعات میں شامل ہیں۔ ’’میثاق‘‘ حقیقتِ دین، فہمِ قرآن، تذکیر و موعظت، تزکیۂ نفس، اصلاحِ معاشرہ اور حسنِ معاشرت جیسے موضوعات پر بھی سنجیدہ اور فکر انگیز مواد پیش کرتا ہے۔ گویا ’’میثاق‘‘ محض ایک اشاعتی کاوش نہیں بلکہ قرآن و سنت کی روشنی میں اپنے قارئین میں تنظیم اسلامی کے نقطۂ نظر، فکری پختگی، دینی ترجیحات و شعور اور اجتماعی ذمہ داری کا احساس بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ ایک ایسی پُرامن، آئینی اور غیر متشدد جدوجہد کے تصور کو فروغ دیتا ہے جس کا ہدف اولاً پاکستان میں باطل نظام کو جڑ سے اُکھاڑ کر خلافتِ راشدہ کے نقشِ قدم پر دینِ حق کے غلبہ اور اسلام کے عادلانہ نظام کا قیام ہے۔

دَارُالاِسلام مرکز تنظیم اسلامی، 23 کلومیٹر، ملتان روڈ، چوہنگ لاہور
Email:markaz@tanzeem.org (042) 35473375-78 فون

سفرِ آخرت کے مراحل اور ہماری ذِمّہ داریاں

شجاع الدین شیخ، امیر تنظیم اسلامی

خطبہ مسنونہ اور تلاوتِ آیات کے بعد!

مَردوں کے احرام کی دو چادریں ہوتی ہیں، جو ہمیں کفن کی یاد دہانی کراتی ہیں۔ ہم نے تلبیہ بار بار پڑھا: لَبَّیْکَ اَللّٰھُمَّ لَبَّیْک ''اے اللہ! میں حاضر ہوں۔ اے اللہ! میں حاضر ہوں۔'' اسی طرح ایک دن موت کا وقت آنا ہے۔ حضرت عزرائیل علیہ السلام نے ہماری روح کو لے کر جانا ہے۔ حج کے لیے ہم اپنے گھر، کاروبار، نوکری، گاڑی، جائیداد، بہت سی چیزوں کو چھوڑ کر آ گئے۔ دورانِ حج، ہمارا سامان کم ہوتا چلا گیا۔ ایک بڑا بیگ اور ایک ہینڈ کیری تھا، لیکن جب ہم منیٰ میں گئے تو ہمارا ہینڈ کیری بھی نیچے رہ گیا۔ مزدلفہ میں جب ہم رات کو سوئے تھے تو نہ اوپر چھت تھی نہ کمرہ تھا، نہ بیڈ تھا، نہ اٹیچ باتھ تھا، نہ اے سی تھا، نہ کوئی بوفے تھا۔ اتنے کم پر بھی ہمارا گزارا ہوا۔ اتنے ہی کم کے ساتھ بلکہ بغیر کسی شے کے، سوائے اس کے کہ کفن کی دو چادریں میسر آ جائیں، یہ پورا سفرِ حج ہمیں آخرت کے سفر کی یاد دہانی کراتا ہے۔ ایک تو یہ نکتہ ہمارے ذہن میں رہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں آخرت کی فکر اور تیاری کی توفیق عطا کرے۔ جس نے اللہ کا گھر دیکھ لیا، مناسک حج کے مقامات کو دیکھ لیا، اللہ کی رحمتوں کو برستے ہوئے دیکھ لیا، عرفات میں اللہ کے جلال کو دیکھ لیا، مدینہ منورہ کی حاضری جسے میسر آ گئی، روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو جس نے دیکھ لیا، اب ہماری زندگی صحیح رُخ پر جائے گی یا نہیں، یہ ہمیں تنہائی میں غور کرنا چاہیے۔ یہاں سے یہ مانگ کر جانا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جیسے حج میں اپنی بندگی کی توفیق دی، پوری زندگی میں بھی اپنی بندگی کی توفیق عطا کر دے۔ اے اللہ! اسلام کی حالت پر ہمیں زندہ رکھ۔ اے اللہ! ہمیں موت بھی

☆ مدینہ منورہ میں حُجّاج کرام کے ایک نمائندہ اجتماع سے خطاب

آئے تو ایمان کی حالت پر آئے۔ ہمارا موضوع ہے: ''سفرِ آخرت کے مراحل اور اس کے حوالے سے ہماری ذمہ داریاں۔'' یہ موضوع قرآن کریم کے ہر دوسرے صفحے پر ملتا ہے۔ رسول اکرم ﷺ کے خطبات میں اکثر ملتا ہے۔ احادیث مبارکہ میں اکثر ملتا ہے۔ آج دنیا میں بڑی رنگینی ہے، بڑی کشش ہے، بڑا عروج ہے، بڑا زوال ہے، بڑی خوشی ہے، بڑی غمی ہے۔ کسی کی طاقت، کسی کی کمزوری، کسی کا ظلم، کسی کی مظلومی یہ سب کچھ دکھائی دے رہا ہے مگر ہمارا دین بتاتا ہے کہ یہ سب کچھ ختم ہو جائے گا اور پھر ایک عالم برپا ہوگا جس کا اقرار ہر نماز کی ہر رکعت میں ہم کرتے ہیں سورۃ الفاتحہ کی تلاوت کرتے ہوئے کہ:

﴿مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝﴾ ''جزا و سزا کے دن کا مالک و مختار ہے۔''

جسے ہم عالمِ آخرت کہتے ہیں۔ اس دنیا کو اللہ نے بنایا ہے، مگر یہ سب کچھ انسان کے امتحان کے لیے ہے۔ سورۃ الکہف میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْاَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۝﴾

''یقیناً ہم نے بنا دیا ہے جو کچھ زمین پر ہے اسے اس کا بناؤ سنگھار تاکہ انہیں ہم آزمائیں کہ ان میں کون بہتر ہے عمل میں!''

یہ ہے اصل حقیقت اس دنیا کی! دنیا نظر آ رہی ہے تو اس پر یقین ہے جبکہ آخرت نظر نہیں آ رہی تو لوگوں کو اس کے بارے میں شبہ ہو جاتا ہے۔ کچھ لوگ سرے سے انکار کرتے ہیں، وہ پکّے کافر ہوتے ہیں، جبکہ کچھ مانتے ہیں مگر تیاری نہیں کرتے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں تیاری کرنے کی توفیق عطا فرمائے! سیدنا علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لوگو آج تم سو رہے ہو، جب موت آئے گی تب تم جاگو گے۔ آج جو کچھ دیکھ رہے ہو یہ دھوکا ہے۔ قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ نے بار بار فرمایا:

﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝﴾ (الانعام)

''اور یہ دنیا کی زندگی تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ صرف دھوکے کا سامان ہے۔''

یہ دنیا کی زندگی نظر آ رہی ہے مگر یہ حقیقت نہیں۔ ہمارا ایمان دیکھی جانے والی شے سے شروع نہیں ہوتا بلکہ اس شے سے شروع ہوتا ہے جو نظر نہیں آتی۔

﴿الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْغَيْبِ﴾ (البقرۃ:۲) ''جو ایمان رکھتے ہیں غیب پر۔''

جو unseen باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ کی ذات کو ہم نے دیکھا نہیں، جنت کو ہم نے دیکھا نہیں، جہنم کو ہم نے دیکھا نہیں۔ بہت سارے امور ہیں غیب کے، نظر نہ آنے والی حقیقتوں کے۔

ہمارا ایمان یہاں سے شروع ہوتا ہے کہ ہم غیب کی باتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

لوگوں نے ''اینڈ (End) آف ٹائم'' کے عنوان سے ڈاکومنٹری بنا دی' پروگرامز کر ڈالے۔ ''اینڈ آف ٹائم'' کا مطلب ہے دنیا کا خاتمہ۔ درحقیقت وہ اینڈ آف ٹائم نہیں ہوگا بلکہ بگننگ (Beginning) آف ٹائم ہوگا۔ یہ دنیا ختم ہوگی تو عالمِ آخرت برپا ہونا ہے۔ جس میدانِ عرفات میں ہم کھڑے ہوئے اور اکیلے اللہ کو پکارا' اسی اللہ کے سامنے میدانِ حشر میں اکیلے اکیلے ہم نے کھڑا ہونا ہے۔ سورۂ مریم میں ارشاد ہوا:

﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿٩٥﴾﴾ (مریم)

''اور قیامت کے دن سب کے سب آنے والے ہیں اُس کے پاس اکیلے اکیلے۔''

موت ایک ایسی اٹل حقیقت ہے جسے کافر بھی مانتا ہے اور مسلمان بھی۔ اس زمین پر کچھ ملحد تو مل جائیں گے' لیکن موت کو نہ ماننے والا ایک بھی نہیں ملے گا۔ موت سب کو نظر آ رہی ہے۔ مسلمان کو بھی' کافر کو بھی۔ امیر کو بھی' غریب کو بھی۔ ہمارے سامنے لوگ مر رہے ہیں۔ ہمارے سامنے لوگ جا رہے ہیں۔ ہم جنازے بھی ادا کر رہے ہیں۔ کل ہماری بھی موت آنی ہے۔ ہم جہاں کہیں بھی ہوں گے وہ آ جائے گی۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ فِيْ بُرُوْجٍ مُّشَيَّدَةٍ ؕ﴾ (النساء:۷۸)

''تم جہاں کہیں بھی ہو گے موت تم کو پالے گی' خواہ تم بڑے مضبوط قلعوں کے اندر ہی ہو۔''

مزید یہ کہ:

﴿وَلَنْ يُّؤَخِّرَ اللّٰهُ نَفْسًا اِذَا جَآءَ اَجَلُهَا ؕ﴾ (المنافقون:۱۱)

''اور اللہ ہرگز مہلت نہیں دے گا کسی جان کو جب اُس کا وقتِ معیّن آ پہنچے گا۔''

نہ کوئی جلدی جاتا ہے' نہ دیر سے جاتا ہے۔ ہر ایک کی سانسیں اللہ کے ہاں معیّن ہیں۔ جس کے چار سال معیّن ہیں' وہ چار سال کے بعد مرے گا۔ جس کے ۴۰ سال معیّن ہیں' وہ ۴۰ کے بعد ہی مرے گا۔ جس کے ۸۰ معیّن ہیں' وہ ۸۰ کے بعد ہی مرے گا۔ یہ اللہ کے ہاں طے ہے۔ مجھے اور آپ کو اس کے متعلق کچھ پتہ نہیں۔ موت کبھی بھی آ سکتی ہے۔ یہ ایک اٹل حقیقت ہے۔ موت کو سمجھانے کے لیے کوئی دلیل دینے کی ضرورت نہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ﴿١٥٦﴾﴾ (البقرۃ)

''بے شک ہم اللہ ہی کے ہیں اور اُسی کی طرف ہمیں لوٹ جانا ہے۔''

اس آیت میں مرنے والے کے لیے کچھ بھی نہیں۔ اس کا ترجمہ ہے کہ بے شک ہم بھی اللہ کے ہیں اور ہمیں لوٹ کر اللہ ہی کی طرف جانا ہے۔ جانے والا اعلان کر کے جا رہا ہے کہ میں تو چلا گیا' اب تُو بھی میرے پیچھے پیچھے آئے گا۔ موت بُری بھی آتی ہے اور اچھی بھی آتی ہے۔ اللہ بُری موت سے ہماری حفاظت فرمائے! شراب پی کر بھی لوگوں کو موت آئی' گانے گا کر بھی لوگوں کو موت آئی۔ برطانیہ میں ایک بوڑھے مسلمان کی موت کا وقت قریب تھا' گھر والے کہہ رہے ہیں اللہ کا ذکر کر' کلمہ پڑھ' لیکن وہ کہتا ہے فلاں فلاں گلوکارہ کا البم مجھے سناؤ' مجھے سکون ملے گا۔ اگر گناہ کرتے ہوئے موت آئے گی تو اللہ کے سامنے کیا منہ لے کر جائیں گے! موت اچھی بھی آتی ہے۔ کبھی سجدے کی حالت میں' کبھی روزے کی حالت میں' کبھی حج کے موقع پر' کبھی احرام کی حالت میں۔ کبھی اللہ کا ذکر کرتے ہوئے بندہ سوتا ہے تو اس حالت میں بھی آتی ہے۔ کبھی خیر کا کام کرنے کے دوران بھی آتی ہے۔ اسی لیے نماز جنازہ میں جو دعائیں کی جاتی ہیں' ان میں ایک دعا یہ بھی ہے:

اَللّٰھُمَّ مَنْ اَحْیَیْتَہٗ مِنَّا فَاَحْیِہٖ عَلَی الْاِسْلَامِ

''اے اللہ! جس کسی کو تو ہم میں سے زندہ رکھے اُسے اسلام پر زندہ رکھ!''

وَمَنْ تَوَفَّیْتَہٗ مِنَّا فَتَوَفَّہٗ عَلَی الْاِیْمَانِ

''اور جس کسی کو تو ہم میں سے وفات دے تو اُسے ایمان کی حالت پر وفات دے۔''

یہ بڑا سخت مرحلہ ہوتا ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے بیٹے عبداللہ ذکر کرتے ہیں کہ ابا جان کے آخری ایام کا معاملہ تھا۔ لیٹے ہوئے تھے کہ سختی کی کیفیت طاری ہو گئی۔ کہنے لگے:

لَا الْاٰنَ، لَا الْاٰنَ، لَا الْاٰنَ! ''ابھی نہیں' ابھی نہیں' ابھی نہیں!''

کیفیت میں کچھ افاقہ ہوا تو بیٹے نے پوچھا: ابا جان! کیا مرنے کو تیار نہیں ہیں؟ آپ کیوں کہہ رہے ہیں کہ ابھی نہیں' ابھی نہیں' ابھی نہیں؟ امام احمد بن حنبلؒ نے کہا: ''بیٹا یہ بات نہیں ہے کہ ابھی میں تیار نہیں۔ بات یہ ہے کہ شیطان مردود آ کر حملے کر رہا ہے اور وسوسے ڈال رہا ہے۔ جب تک کہ خاتمہ ایمان پر نہ ہو جائے' میں بچ نہیں سکتا۔'' شیطان ہمارا دشمن ہے۔ جب آخری مرحلہ ہو گا تو وہ بھی پورا زور لگائے گا۔ مرتے وقت بھی شیطان ورغلانے کی کوشش کرتا ہے۔ ذرا تنہائی میں سوچیں کہ ہم کتنا اللہ سے یہ مانگتے ہیں کہ اسلام پر زندہ رکھ' ایمان پر خاتمہ عطا فرما' برے

خاتمے سے بچا! ضروری نہیں کہ موت ۶۰ یا ۷۰ سال کے بعد آئے۔ ہم نے اپنے ہاتھوں سے چھوٹے بچوں کو غسل بھی دیا‘ ان کا جنازہ بھی پڑھایا‘ ان کو دفن بھی کیا ہے۔ اللہ کے ہاں یہ طے ہے مگر میرے اور آپ کے پاس کوئی گارنٹی نہیں۔ آج محنت کرنی ہے‘ تیاری کرنی ہے‘ کل تک موقوف نہیں کرنا۔ قرآن ہمیں کہتا ہے:

﴿وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ﴿۱۰۲﴾﴾ (آل عمران)

’’اور تمہیں ہرگز موت نہ آنے پائے مگر فرماں برداری کی حالت میں!‘‘

اللہ کی فرماں برداری حج تک محدود نہیں ہے‘ عمرے تک محدود نہیں ہے‘ رمضان تک محدود نہیں ہے‘ قربانی تک محدود نہیں ہے۔ خوشی کا موقع ہو تو مسلم بننا ہے‘ غمی کا موقع ہو تو مسلم بننا ہے۔ یہ ہے پوری زندگی کا تقاضا!

یہ موت کہیں بھی آسکتی ہے‘ کبھی بھی آسکتی ہے۔ اس کے بعد تدفین ہو جاتی ہے۔ اگر کسی کو قبر نہ بھی ملے تو وہ اللہ کے علم میں ہے‘ اس کے علم سے باہر نہیں۔ دنیا اور آخرت کے درمیانی وقفے کا نام برزخ ہے۔ یہ لفظ قرآن پاک میں آیا۔ قبر کا لفظ بھی قرآن پاک میں آیا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ’’قبر جنت کے باغیچوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے‘‘۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جب مردے کو دفن کر دیا جاتا ہے تو دو فرشتے آتے ہیں منکر اور نکیر۔ چند سوالات کرتے ہیں‘ جن کے جواب ان کو بالکل سیدھے سیدھے اور صحیح صحیح چاہئیں۔

مَنْ رَّبُّکَ؟ ’’تمہارا رب کون ہے؟‘‘

مَا دِیْنُکَ؟ ’’تمہارا دین کیا ہے؟‘‘

مَنْ نَبِیُّکَ ’’تمہارے نبی کون ہیں؟‘‘

روایات میں یہ بھی ہے کہ حضور ﷺ کا چہرۂ نور پیش کیا جائے گا اور پوچھا جائے گا کہ بتاؤ ان کے بارے میں تمہارا کیا عقیدہ ہے! واقعتاً مسلمان ہوگا تو اللہ کو بھی مانتا ہوگا‘ اللہ کی بھی مانتا ہوگا۔ توجہ کیجیے گا اللہ کو تو سب مسلمان مان رہے ہیں‘ اللہ کی کتنے لوگ مان رہے ہیں؟ دین کو سب مسلمان ہی مان رہے ہیں‘ دین کی کتنی مان رہے ہیں؟ رسول اللہ ﷺ کو سب ہی مان رہے ہیں‘ رسول اللہ ﷺ کی کتنی مان رہے ہیں؟ یہ پوری زندگی کا اہم مسئلہ ہے۔ آج اگر اس رُخ پر ہوں کہ اللہ کی بھی مان رہے ہوں‘ اللہ کے دین اسلام کی بھی مان رہے ہوں‘ اللہ کے

رسول ﷺ کی بھی مان رہے ہوں تو جواب دے سکیں گے:

اَللّٰہُ رَبِّیْ ''اللہ میرا رب ہے''

اَلْاِسْلَامُ دِیْنِیْ ''اسلام میرا دین ہے''

مُحَمَّدٌ ﷺ نَّبِیِّیْ ''محمد مصطفی ﷺ میرے نبی ہیں۔''

اب حج سے جاتے ہوئے تنہائی میں سوچنا ہے کہ اللہ کی کتنی نافرمانیاں کیں! اللہ نے تو عرفات کے دن پاک صاف کر دیا۔ اب سوچیں کہ میری زندگی کس رُخ پر ہوگی۔ جھوٹ تو نہیں ہوگا میری زبان پر؟ زبان پر گالیاں تو نہیں ہوں گی؟ زبان پر جھوٹے وعدے اور جھوٹی قسمیں تو نہیں ہوں گی؟ ماں باپ کا دل تو نہیں دکھائیں گے؟ پڑوسی کا حق تو نہیں ماریں گے؟ کسی کا قرض دبا کر بیٹھ تو نہیں جائیں گے؟ ناپ تول میں کمی تو نہیں کریں گے؟ رشوت کا معاملہ تو نہیں کریں گے؟ سود خوری کا معاملہ تو نہیں کریں گے؟ وراثت میں سے کسی کا حق تو نہیں مار جائیں گے؟ نمازیں ضائع تو نہیں کریں گے؟ قرآن بند تو نہیں ہو جائے گا؟ ہمارے ۹۹ فیصد لوگ ہیں جنہوں نے آج تک قرآن کریم کو سمجھ کر نہیں پڑھا۔ انہیں یہ پتہ ہی نہیں ہے کہ اللہ چاہتا کیا ہے' تو اللہ کی مانیں گے کیسے؟ ارادہ کر کے جائیں کہ قرآن کو ترجمے سے پڑھیں گے' تشریح سے پڑھیں گے۔ قرآن کی محفلوں میں بیٹھیں گے۔ دین کی محفلوں میں بیٹھیں گے۔ دین کو سیکھیں گے۔ اسلام کا پتہ چلے گا تب ہی اس پر عمل ہوگا۔ یہ تین اہم ترین سوالات ہیں آپ کی زندگی کے۔ بتاؤ تمہارا ربّ کون ہے؟ بتاؤ تمہارا دین کیا ہے؟ بتاؤ تمہارے نبی کون ہیں؟ اللہ تعالیٰ یہ سوالات ہم سب پر آسان فرمائے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے فرض نماز کے بعد دعائیں کیں:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ عَذَابِ جَھَنَّمَ، وَ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الْمَسِیْحُ الدَّجَّالِ، وَ اَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْمَاْثَمِ وَ الْمَغْرَمِ، وَ اَعُوْذُ بِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الْمَحْیَا وَ الْمَمَاتِ

اللہ کے رسول ﷺ بخشے بخشائے ہیں' معصوم ہیں' خطاؤں سے پاک ہیں۔ آج ہم روضۂ رسول پر سلام بھی کرتے ہیں' شفاعت کی دعا بھی کرتے ہیں۔ وہ جو بخشے بخشائے ہیں' وہ ہر نماز کے بعد دعا کرتے: ''اے اللہ! میں تیری پناہ میں آنا چاہتا ہوں قبر کے عذاب سے.....'' ہم میں سے کتنے لوگوں کو قبر کا عذاب رلاتا ہے؟ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب کسی قبر پر گزرتے تو زار و

قطار روتے۔ داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ پوچھا جاتا: جنت کا ذکر، جہنم کا ذکر اور معاملات کا ذکر آتا ہے تو یہ کیفیت طاری نہیں ہوتی، قبر کو دیکھ کر کیوں طاری ہوتی ہے؟ سیدنا عثمانؓ فرماتے: مَیں نے اللہ کے رسول ﷺ سے سنا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''قبر آخرت کے مرحلوں میں سے پہلا مرحلہ ہے، جو ادھر کامیاب ہوگا وہ آگے بھی کامیاب ہوگا، جو ادھر ناکام ہوگا، وہ آگے بھی ناکام ہوگا۔'' یہ وہ ہستی ہیں جنھوں نے غزوۂ تبوک کے موقع پر اتنا خرچ کیا کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ''آج کے بعد عثمان کچھ بھی کرے، سب معاف ہے۔'' جن کو یہ اعلانات اللہ کے رسول ﷺ کی زبان سے ملے، وہ قبر کو دیکھ کر روتے تھے۔ کیا مجھے اور آپ کو رونا آتا ہے؟ قبر یاد رہتی ہے؟ قبر کے سوالات یاد رہتے ہیں؟

برزخ کی زندگی کے بارے میں اللہ کے رسول ﷺ کی طویل حدیث ہے۔ اس کے چند حاصل میں آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ اللہ کا فرماں بردار بندہ جب قبر کے حوالے کیا جاتا ہے تو قبر خوش ہوتی ہے، استقبال کرتی ہے، مبارک باد دیتی ہے۔ قبر اس سے کہتی ہے: زمین پر چلنے پھرنے والے جتنے لوگ تھے، تُو مجھے سب سے زیادہ پسند تھا۔ آج تُو میرے حوالے کر دیا گیا، دیکھ میں تیرے ساتھ کتنا اچھا سلوک کرتی ہوں۔ پھر وہ قبر حدِ نگاہ تک اس کے لیے وسیع کر دی جاتی ہے۔ اس کے لیے جنت کی کھڑکی کھول دی جاتی ہے جہاں سے خوشبو بھری ہوائیں آنا شروع ہو جاتی ہیں۔ ایسی راحت والی قبر اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو عطا فرمائے! میرے اور آپ کے اصل مسئلے یہ ہیں۔ یہ ملین ڈالر نہیں، بلین ڈالر questions ہیں۔ اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کا کوئی نافرمان بندہ جب قبر کے حوالے کیا جاتا ہے تو قبر سختی سے کلام کرتی ہے اور کہتی ہے: زمین پر جتنے چلنے پھرنے والے تھے، تُو مجھے سب سے زیادہ مبغوض تھا۔ تُو مجھے سب سے زیادہ ناپسند تھا۔ آج جب تُو میرے حوالے کر دیا گیا ہے تو دیکھ میں تیرے ساتھ کیا سلوک کرتی ہوں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ وہ قبر اس کو بھینچنا شروع کرتی ہے اور آپ ﷺ نے اپنے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں ایک دوسرے میں ڈال کر بتایا کہ ایسے اس کی پسلیاں اور ہڈیاں داخل ہوتی ہیں ایک دوسرے کے اندر۔ قبر بھینچتی ہے، پھر بھینچتی ہے اور بھینچتی رہتی ہے۔ اللہ تعالیٰ قبر کے عذاب سے ہماری حفاظت فرمائے۔ یہ ہمارے سب سے بڑے مسئلے ہیں، جن پر آج کوئی بات نہیں ہوتی۔ اتنی زیادہ مادہ پرستی ہے اور دجّال کا دجل اتنا غالب آ گیا ہے کہ جو دکھائی دے رہا

ہے اسی پر ساری بحثیں ہیں جبکہ جو دکھائی نہیں دے رہا اس پر کلام ہی نہیں۔ اللہ کے رسولؐ نے فرمایا: اس نافرمان کو ہتھوڑوں سے مارا جاتا ہے اور اس کی آواز کو انسان و جنات کے سوا ہر مخلوق سنتی ہے۔ یہ بھی فرمانِ رسول ﷺ ہے کہ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم اپنے مُردوں کو دفنانا چھوڑ دو گے تو میں اللہ سے التجا کرتا' وہ تمہیں دکھاتا کہ قبر میں مُردے کو کس طرح عذاب ہوتا ہے۔ اللہ اکبر کبیرا!

یہ برزخ کا معاملہ ہے۔ پھر جب اللہ چاہے گا' یہ دنیا ختم ہوگی۔ سورۃ الفجر میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿كَلَّآ إِذَا دُكَّتِ الْأَرْضُ دَكًّا دَكًّا ﴿٢١﴾ وَجَآءَ رَبُّكَ وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا ﴿٢٢﴾﴾

''ہرگز نہیں! جب زمین کو کوٹ کوٹ کر ہموار کر دیا جائے گا۔ اور آپ کا ربّ جلوہ فرما ہوگا جب کہ فرشتے قطار در قطار حاضر ہوں گے۔''

یہ ساری زمین کوٹ کوٹ کر بالکل چٹیل کر دی جائے گی' اور تمہارا رب بھی موجود ہوگا اور فرشتے صفیں باندھ کر حاضر ہوں گے۔ یہ حشر کا میدان برپا ہوگا اور اس کی کئی تفصیلات ہیں۔ سورۃ التکویر میں ارشاد ہوا:

﴿إِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ ①﴾ ''جب سورج لپیٹ لیا جائے گا۔''

سورۃ الانفطار میں بتایا گیا:

﴿إِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ①﴾ ''جب آسمان پھٹ جائے گا۔''

جبکہ سورۃ الانشقاق میں فرمایا گیا:

﴿إِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ ①﴾ ''جب آسمان پھٹ جائے گا۔''

یہ تینوں سورتیں آخری پارے کے شروع میں ہیں: سورۃ التکویر' سورۃ الانفطار اور سورۃ الانشقاق۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: جو تم میں سے قیامت کے مناظر کو دیکھنا چاہے' ان تین سورتوں کا مطالعہ کر لے۔ سورۃ الانفطار کی شروع کی آیتیں ہیں:

﴿إِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ ① وَإِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ ② وَإِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ ③ وَإِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ ④﴾

''جب آسمان پھٹ جائے گا۔ اور جب تارے بکھر جائیں گے۔ اور جب سمندر پھاڑ دیے جائیں گے۔ اور جب قبریں تلپٹ کر دی جائیں گی۔''

﴿عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ وَاَخَّرَتْ ۝۵﴾

''(اُس وقت) ہر جان' جان لے گی کہ اُس نے کیا آگے بھیجا اور کیا پیچھے چھوڑا۔''

آج ہم سورج' چاند اور ستاروں کو دیکھتے ہیں' یہ سارا نظام تلپٹ ہو جائے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَجُمِعَ الشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۝۹﴾ (القیامۃ)

''اور سورج اور چاند یکجا کر دیے جائیں گے۔''

سورج اور چاند کو جمع کر دیا جائے گا اور ستارے بے نور کر دیے جائیں گے۔ یہ عالَمِ دنیا ختم کر دیا جائے گا جبکہ ایک اور عالَمِ آخرت میں برپا کیا جائے گا۔ ہر ایک کو اللہ کے سامنے پیش ہونا ہوگا۔ اُمتوں کی سطح پر بھی پیشی ہوگی اور انفرادی سطح پر بھی پیشی ہوگی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿فَلَنَسْئَلَنَّ الَّذِيْنَ اُرْسِلَ اِلَيْهِمْ وَلَنَسْئَلَنَّ الْمُرْسَلِيْنَ ۝۶﴾ (الاعراف)

''پس ہم لازماً پوچھ کر رہیں گے اُن سے بھی جن کی طرف ہم نے رسولوں کو بھیجا اور لازماً پوچھ کر رہیں گے رسولوں سے بھی۔''

رسولوں سے اس بات کا سوال ہوگا کہ اللہ کا پیغام پہنچایا کہ نہیں پہنچایا! اللہ کے رسول ﷺ نے جب خطبہ حجۃ الوداع دیا تو اس کے آخر میں فرمایا: ((اَلَا هَلْ بَلَّغْتُ)) ''کیا میں نے تم تک اللہ کا پیغام پہنچا دیا؟'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: آپ ﷺ نے حقِ وصیت' حقِ نصیحت' حقِ امانت ادا کر دیا۔ سب صحابہؓ نے گواہی دی کہ اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی ذمہ داری پوری کر دی۔ پھر اللہ کے رسول ﷺ نے اپنی انگشت شہادت آسمان کی طرف بلند کر کے فرمایا: ((اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ، اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ، اَللّٰهُمَّ اشْهَدْ)) ''اے اللہ تُو گواہ رہ' اے اللہ تُو گواہ رہ' اے اللہ تُو گواہ رہ!'' یہ گواہی دے رہے ہیں کہ میں نے پہنچا دیا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے گواہی اس لیے لے لی کیونکہ آپ ﷺ نے بھی گواہی دینی ہے۔ ایک وہ آیت بھی ہے جس پر اللہ کے رسول ﷺ اشک بار ہوئے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ قرآن پاک کی تلاوت کرو۔ انہوں نے سورۃ النساء کی تلاوت شروع کی۔ حضور ﷺ سر جھکا کے تلاوت سماعت کر رہے تھے۔ جب آیت ۴۱ پر پہنچے تو آپ ﷺ نے فرمایا: حَسْبُکَ حَسْبُکَ حَسْبُکَ۔ ''کافی ہے' کافی ہے' کافی ہے!'' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ عرض کرتے ہیں میں نے نگاہ اٹھا کر دیکھا کہ آپ ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہیں اور داڑھی مبارک آنسوؤں سے تر ہے۔ وہ آیت یہ تھی:

﴿فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍۢ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ﴿٤١﴾﴾

''تو اُس دن کیا صورت حال ہوگی جب ہم ہر اُمّت میں سے ایک گواہ کھڑا کریں گے اور (اے نبی ﷺ) آپ کو لائیں گے ہم ان پر گواہ بنا کر۔''

رسولوں سے بھی سوال ہوگا اور جن کی طرف رسولوں کو بھیجا گیا' ان اُمتوں سے بھی سوال ہوگا۔ مجھ سے اور آپ سے بھی سوال ہوگا۔ اجتماعی سطح پر بھی سوال ہوگا۔ اللہ کے پیغمبر ﷺ اُمّت کو پورا قرآن دے کر گئے۔ پورا دین مکمل کر کے گئے۔ پورا اُسوہ دے کر گئے' دین قائم کر کے گئے' دین کی گواہی ہمارے ذمے ڈال کر گئے' ختمِ نبوت کا عقیدہ بتا کر گئے کہ میں آخری نبی ہوں' میرے بعد کوئی نبی نہیں اور تم آخری اُمت ہو تمہارے بعد کوئی اُمّت نہیں۔ ختمِ نبوت کے بعد یہ میری اور آپ کی ذمہ داری ہے۔

اللہ کے رسول ﷺ نے اپنے قول سے بھی گواہی دی' اپنے عمل سے بھی گواہی دی' اپنی جدّوجُہد سے گواہی دی' اپنا خونِ اطہر طائف میں اور اُحد کے میدان میں پیش کر کے گواہی دی۔ رسول اللہ ﷺ نے اللہ کا دین غالب کر کے دکھایا۔ اب ختم نبوت کے بعد میں اور آپ ذمہ دار ہیں۔ مجھے اور آپ کو کھڑا کیا گیا۔ مجھے اور آپ کو چنا گیا ہے۔ میں نے اور آپ نے گواہی دینی ہے۔ سوچیے اگر ہم خود ہی قرآن نہ پڑھیں تو دوسروں کو کیا پہنچائیں گے۔ قرآن ہم نہ سمجھیں تو ہمیں کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کیا چاہتا ہے۔ ایسے میں ہم دوسروں کو کیا بتائیں گے۔ ہم دین پر خود عمل نہ کریں تو دوسروں کو کیا پہنچائیں گے۔ ہمارے اپنے ملک پاکستان میں اسلام قائم نہ ہو تو ہم دنیا کے سامنے کیا پیش کریں گے؟ بقول اقبال:

وقتِ فرصت ہے کہاں' کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

یہ ذمہ داری میری اور آپ کی ہے۔

حشر کے میدان کی بہت ساری تفصیلات ہیں کہ لوگوں کی حالت اور کیفیات کیا ہوں گی۔ احادیث میں بھی تفصیلات آتی ہیں۔ کس کس انداز سے پیشی ہوگی' اجتماعی بھی اور انفرادی بھی۔ سوالات کیا ہونے ہیں۔ کچھ لوگ جھوٹ بولنا چاہیں گے لیکن اللہ تعالیٰ ان کے منہ بند کر دے گا۔ انسانوں کے چھ اعضاء گواہی دیں گے۔ نامہ اعمال دیا جائے گا۔ پُل صراط سے گزارا جائے گا۔

پھر جہنم اور جنت کے فیصلے کا معاملہ ہے۔ جنت والوں کے لیے اللہ کا دیدار بھی ہے اور اللہ کی رضا کا اعلان بھی ہے۔

انفرادی سطح پر بھی اللہ کے سامنے ہر ایک نے پیش ہونا ہے۔ باپ اپنا جواب دے گا' بیٹا اپنا جواب دے گا۔ ماں اپنا جواب دے گی' بیٹی اپنا جواب دے گی۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿٩٥﴾﴾ (مریم)

''اور قیامت کے دن سب کے سب آنے والے ہیں اُس کے پاس اکیلے اکیلے۔''

طبرانی شریف کی حدیث ہے کہ قیامت کے دن پہلا سوال نماز کے بارے میں ہونا ہے۔ جس کی نماز درست ہوگی' اس کے باقی معاملات بھی درست ہوں گے۔ جس کی نماز میں کمی' کوتاہی' بگاڑ ہوگا تو اس کے باقی معاملات بھی بگاڑ کا شکار ہو جائیں گے۔

جامع ترمذی کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: بندے کے قدم اس کی جگہ سے ہٹ نہیں سکیں گے جب تک وہ پانچ سوالات کے جوابات پیش نہ کرے۔ یہ بھی زندگی کے اہم ترین سوالات ہیں جو کسی سیٹلائٹ چینل کے پروگرام میں نہیں ملیں گے' کسی سٹیٹس اَپ ڈیٹ میں نہیں ملیں گے' کسی ہیڈ لائن نیوز میں نہیں ملیں گے۔ کوئی نہیں بتاتا اِلّا یہ کہ دینی محفل ہو۔

(۱) زندگی کہاں لگائی؟ یہ زندگی ہماری نہیں' اللہ کی دین ہے۔ اللہ کی امانت ہے ہمارے پاس۔

(۲) جوانی کہاں کھپائی؟ زندگی کا peak ٹائم' گرین ٹائم' بہترین ٹائم' جوانی ہے' جب انسان میں پہاڑوں سے ٹکرانے کا حوصلہ ہوتا ہے۔

(۳) مال کہاں سے کمایا؟ حلال سے یا حرام سے؟ رشوت کا بھی آ رہا ہے' سود کا بھی آ رہا ہے' دو نمبر بھی آ رہا ہے' لوٹ مار کا بھی آ رہا ہے۔ وراثت کا ہڑپ کردہ بھی آ رہا ہے۔ ایک دوسری حدیث میں ذکر آتا ہے کہ حرام سے پلا ہوا جسم جہنم کا مستحق ہے' وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ حرام کے ساتھ دعا قبول نہیں ہوتی۔ حرام کے ساتھ صدقہ قبول نہیں ہوتا۔

(۴) مال کہاں خرچ کیا؟ حلال میں یا حرام میں؟ جائز میں یا ناجائز میں؟ آج شادی بیاہ کے موقع پر پیسہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ اپنے نام نہاد سٹیٹس کو اوپر رکھنے کے لیے ہندوانہ رسومات پر پیسہ بے دریغ خرچ کیا جاتا ہے۔ فلسطین کے بچے بھی یاد رہتے ہیں

ہمیں کبھی؟ اپنے ملک کے یتیم بچے‘ بوڑھے‘ بیوائیں جو کھانے پینے کے محتاج ہوں وہ یاد رہتے ہیں؟

(۵) جو علم حاصل کیا اس پر کتنا عمل کیا؟ آج حج میں تو ہر بندہ مفتی بنا ہوا ہے۔ علمی بحثوں میں لگا ہوا ہے۔ استغفر اللہ! اتنا علم آ گیا تبھی تو بحث ہو رہی ہے۔ چیٹ جی پی ٹی آ گیا‘ اے آئی آ گیا‘ میٹ آ گیا‘ جی این آئی آ گیا۔ دماغ میں اتنا علم آ گیا ہے‘ عمل میں کیا ہے؟ رات بھر بحث‘ صبح فجر میں گُل۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ہمارے ہاں مذہب کے نام پر تو لڑ پڑیں گے‘ اتنا لڑ پڑیں گے کہ جان دے دیں گے یا لے لیں گے لیکن عمل کے میدان میں ہمارے پاس ٹائم نہیں۔

جب اللہ اٹھائے گا تو کیفیات مختلف ہوں گی۔ ممکن ہے کوئی احرام کی حالت میں انتقال کر گیا تو حالتِ احرام میں اٹھایا جائے گا۔ شہید ہے تو اس کا خون رس رہا ہوگا۔ مظلومانہ قتل کیا گیا تو اللہ ظالم سے اس کا حساب لے گا۔ ایک کیفیت یہ ہے کہ کچھ لوگوں کو اندھا کر کے کھڑا کیا جائے گا۔ سورۂ طٰہٰ میں ہلا دینے والی آیت ہے:

﴿وَمَنْ اَعْرَضَ عَنْ ذِكْرِيْ فَاِنَّ لَهٗ مَعِيْشَةً ضَنْكًا وَّنَحْشُرُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَعْمٰى ﴿۱۲۴﴾﴾

’’اور جس نے میری یاد سے اعراض کیا تو یقیناً اُس کے لیے ہوگی (دنیا کی) زندگی بہت تنگی والی اور ہم اٹھائیں گے اُسے قیامت کے دن اندھا (کر کے)۔‘‘

ذکر سے یہاں مراد قرآن ہے۔ جس نے قرآن سے اعراض کیا‘ اس کو فراموش کیا‘ نظر انداز کیا تو اس کی معیشت تنگ ہوگی۔ ایسے شخص کو قیامت کے دن اندھا بنا کر کھڑا کیا جائے گا۔

﴿قَالَ رَبِّ لِمَ حَشَرْتَنِيْٓ اَعْمٰى وَقَدْ كُنْتُ بَصِيْرًا ﴿۱۲۵﴾﴾

’’وہ کہے گا: اے میرے پروردگار! تُو نے مجھے اندھا کیوں اٹھایا ہے‘ جبکہ مَیں (دنیا میں) تو بینائی والا تھا۔‘‘

﴿قَالَ كَذٰلِكَ اَتَتْكَ اٰيٰتُنَا فَنَسِيْتَهَا ۚ وَكَذٰلِكَ الْيَوْمَ تُنْسٰى ﴿۱۲۶﴾﴾

’’اللہ فرمائے گا کہ اسی طرح ہماری آیات تمہارے پاس آئیں تو تم نے انہیں نظر انداز کر دیا‘ اور اسی طرح آج تمہیں بھی نظر انداز کر دیا جائے گا۔‘‘

انگلش میں کہتے ہیں: tit for tat۔ اردو میں کہتے ہیں: جیسے کو تیسا۔ تمہارے پاس میرے قرآن کے لیے وقت نہیں تھا‘ جاؤ دفع ہو جاؤ‘ میری رحمت میں سے تمہارے لیے کوئی حصہ نہیں۔

روزِ محشر اللہ کے رسول ﷺ اپنے اُمتیوں کو کیسے پہچانیں گے؟ جسم کے جو اعضاء وضو

میں استعمال ہوتے ہیں' وہ چمک رہے ہوں گے۔ چنانچہ وضو اچھے انداز سے کرنا چاہیے اور کوشش کرنی چاہیے کہ بندہ ہر وقت باوضو رہے۔

زندہ دفن کی گئی لڑکی کے حوالے سے سورۃ التکویر میں آیا ہے:

﴿وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ ۝۸ بِاَیِّ ذَنْۢبٍ قُتِلَتْ ۝۹﴾

''اور جب زندہ دفن کی گئی لڑکی سے پوچھا جائے گا' کہ وہ کس گناہ کی پاداش میں قتل کی گئی تھی؟''

ایسا زمانۂ جاہلیت میں ہوتا تھا۔ آج بھی بیٹوں کو بیٹیوں پر ترجیح دے کر جیتے جی بیٹیوں کو مار دیتے ہیں۔ کبھی الٹرا ساؤنڈ سے پتہ چلتا ہے کہ پیدا ہونے والی ذات بچی ہے تو حمل کو ضائع کروا دیتے ہیں۔ یاد رکھنا چاہیے کہ چار مہینے کے بعد جان بوجھ کر abortion کرانا قتل کے برابر ہے۔ اللہ چھوڑے گا نہیں' پوچھے گا۔ میں صرف اشارے کر رہا ہوں' بہت ساری تفصیلات کل اعمال نامہ میں ہمیں پیش ہوں گی۔ سب کچھ دکھایا جائے گا۔ سورۃ الزلزال میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿فَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَیْرًا یَّرَهٗ ۝۷ وَمَنْ یَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا یَّرَهٗ ۝۸﴾

''تو جس کسی نے ذرّہ کے ہم وزن بھی کوئی نیکی کی ہوگی وہ اُسے دیکھ لے گا۔ اور جس کسی نے ذرّہ کے ہم وزن کوئی بدی کی ہوگی وہ بھی اُسے دیکھ لے گا۔''

سورۃ الکہف میں فرمایا گیا:

﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا یُغَادِرُ صَغِیْرَةً وَّلَا كَبِیْرَةً اِلَّاۤ اَحْصٰىهَا ۚ﴾ (آیت ۴۹)

''یہ کیسا اعمال نامہ ہے؟ اس نے تو نہ کسی چھوٹی چیز کو چھوڑا ہے اور نہ کسی بڑی کو۔''

آج ریکارڈنگ کو سمجھنا کوئی مشکل بات نہیں ہے۔ یہ کیمرہ لگا ہوا ہے۔ جو چاہے اس گفتگو کو لائیو دیکھ لے۔ ریکارڈ ہو جائے گا تو بعد میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ اگر مجھ سے کوئی غلطی ہوئی ہوگی تو slow کر کے اسے نکال دیا جاتا ہے۔ پروگرام ایڈٹ ہو جاتا ہے۔ ایڈیٹر کو پتہ ہے کہ کسی اور جگہ کیا کہا تھا' وہاں سے اٹھا کر یہاں لگا دے گا۔ کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا۔ انسان یہ کر رہا ہے تو رحمان کے لیے کیا مشکل ہے! آج ہم کیمروں سے ڈرتے ہیں' اللہ کہتا ہے میں تمہیں دیکھ رہا ہوں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَهُوَ مَعَكُمْ اَیْنَ مَا كُنْتُمْ ؕ﴾ (الحدید: ۴)

''اور تم جہاں کہیں بھی ہوتے ہو وہ تمہارے ساتھ ہوتا ہے۔''

اور:

﴿وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ﴿١٦﴾﴾ (قٓ)

''اور ہم تو اُس سے اُس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔''

روزِ محشر کچھ لوگ جھوٹ بولنا چاہیں گے کہ ہم تو ایسے نہیں تھے۔ سورۃ الانعام میں ہے کہ مشرکین کہیں گے:

﴿وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ ﴿٢٣﴾﴾

''اللہ کی قسم جو ہمارا ربّ ہے، ہم مشرک نہیں تھے!''

اللہ تعالیٰ ان کے منہ بند کر دے گا۔ سورۂ یٰس میں فرمایا گیا:

﴿اَلْيَوْمَ نَخْتِمُ عَلٰٓى اَفْوَاهِهِمْ وَتُكَلِّمُنَآ اَيْدِيْهِمْ وَتَشْهَدُ اَرْجُلُهُمْ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٦٥﴾﴾

''آج ہم اُن کے مونہوں پر مہر لگا دیں گے اور اُن کے ہاتھ ہم سے باتیں کریں گے اور اُن کے پاؤں گواہی دیں گے اُس کمائی کے بارے میں جو وہ کرتے رہے تھے۔''

سورۃ النّور میں ایک جگہ آتا ہے زبان اللہ کے حکم سے بولے گی۔ جھوٹ بولنا چاہیں گے تو اللہ زبان بند کر دے گا۔ سورۃ حٰمٓ السجدۃ میں آتا ہے کہ بندے اپنے اعضاء سے پوچھیں گے:

﴿لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا ۭ﴾ (آیت ۲۱) ''تم نے کیوں ہمارے خلاف گواہی دی؟''

﴿قَالُوْٓا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾

''وہ کہیں گی کہ ہمیں بھی اُس اللہ نے بولنے کی صلاحیت عطا کر دی ہے جس نے ہر شے کو قوتِ گویائی عطا کی ہے۔''

انسانی جسم کے چھ اعضاء کی گواہی ہوگی: ہاتھ کی گواہی، پیر کی گواہی، زبان کی گواہی، آنکھ کی گواہی، کان کی گواہی، کھال کی گواہی۔ میرا ہاتھ اللہ کی امانت ہے۔ میری آنکھ اللہ کی امانت ہے۔ میری زبان اللہ کی امانت ہے۔ اس کے لیے اللہ کے رسول ﷺ نے اماں عائشہ رضی اللہ عنہا کو دعا سکھائی۔ فرمایا: عائشہ دعا کیا کرو: اَللّٰهُمَّ حَاسِبْنِيْ حِسَابًا يَّسِيْرًا ''اے اللہ! میرے حساب کو آسان کر دے۔'' اماں عائشہ رضی اللہ عنہا نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! یہ آسان حساب کیا ہے؟ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ اللہ کسی کا نامہ اعمال نہ کھولے اور نہ پوچھے۔ جس کا کھل گیا اور اللہ نے پوچھ لیا، وہ مارا گیا۔ دنیا میں کسی کمپنی میں گڑبڑ ہوتی ہے تو ایک آفیسر کو بٹھاتے ہیں۔ وہ چار سوال

کرے تو ملزم ڈھیر ہو جاتا ہے۔ بڑا مسئلہ ہو تو نیب والے اٹھا کر لے جاتے ہیں۔ چار سوال کرتے ہیں‘ بندہ سیدھا ہو کر جواب دے دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے سامنے کون بحث کر سکے گا!

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ’’عائشہ! تین جگہ کوئی کسی کو نہیں پوچھے گا۔ جب نامہ اعمال دیا جائے گا‘ جب اعمال کو تولا جائے گا‘ جب الصراط سے گزارا جائے گا۔‘‘ الصراط جہنم کے اوپر بڑا تنگ راستہ ہے۔ اس کی تفاصیل احادیث میں آتی ہیں کہ وہاں اندھیرا ہے اور وہی گزر سکے گا جس کے پاس نور یعنی روشنی ہوگی۔ وہ روشنی دنیا میں ایمان اور نیک اعمال کا نور ہے۔ قرآن حکیم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿یَسْعٰی نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَبِاَیْمَانِهِمْ﴾ (الحدید:۱۲)

’’ان کا نُور دوڑتا ہوگا اُن کے سامنے اور اُن کے داہنی طرف‘‘

دائیں طرف سے مراد نیک اعمال کا نور ہے جبکہ سامنے سے مراد دل میں ایمان کا نور ہے۔ یہ روشنی کسی کے پاس کم ہوگی‘ کسی کے پاس زیادہ۔ یہ روشنی دنیا میں تلاش کرنی ہے۔ جس نے آج دنیا میں تیاری کی‘ کل وہ اندھیرے کے اندر روشنی پائے گا اور الصراط سے گزر جائے گا۔ منافقین ایمان والوں سے کہیں گے:

﴿اُنْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ﴾ (آیت ۱۳)

’’ذرا ہمارا انتظار کرو کہ ہم بھی تمہاری روشنی سے فائدہ اُٹھالیں۔‘‘

﴿قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ﴾

’’کہا جائے گا: لوٹ جاؤ پیچھے کی طرف اور تلاش کرو نُور!‘‘

جاؤ پیچھے دفع ہو جاؤ! وہاں پر جا کر تلاش کرو۔ جانے کا موقع نہیں ہوگا مگر یہ ان کی ذلت اور رسوائی کے لیے کہا جائے گا۔ عمل کا موقع تو دنیا میں تھا۔ آخرت میں تو نتیجے ہیں۔ جس کو آخرت میں نور چاہیے‘ وہ دنیا میں تلاش کرے۔ ایک ہی چانس ہے۔ ہمارے بچوں کے امتحانات کی طرح نہیں کہ ایک سمسٹر میں فیل ہو گئے تو اگلے سمسٹر میں پاس ہو جائیں گے۔ ایک مرتبہ اللہ نے زندگی دی ہے تو الصراط سے گزرنے کے لیے آج ایمان کا نور اور نیک اعمال کا نور تیار کرنا ہے۔ اس کے بعد الصراط سے گزرتے ہوئے اہلِ جہنم وہیں گرا دیے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو محفوظ رکھے! اہلِ جنت وہاں سے گزار کر جنت میں پہنچا دیے جائیں گے۔

دو تہائی قرآن حکیم مکّی سورتوں پر مشتمل ہے‘ جن میں آخرت کا بہت کثرت سے بیان

ہے۔ جنت کا بھی اور جہنم کا بھی۔ اللہ کے رسول ﷺ جو خطاؤں سے پاک ہیں‘ معصوم ہیں‘ بخشے بخشائے ہیں‘ جن کی شفاعت کی ہم اللہ سے التجا کرتے ہیں اور امید بھی رکھتے ہیں‘ وہ نماز کے بعد کے اذکار میں یہ دعا فرماتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ اَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ! اَللّٰھُمَّ اَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ! اَللّٰھُمَّ اَجِرْنِیْ مِنَ النَّارِ!

’’اے اللہ! مجھے آگ سے بچالے۔ اے اللہ! مجھے آگ سے بچالے۔ اے اللہ! مجھے آگ سے بچالے۔‘‘

وہ معصوم ہو کر روزانہ صبح سات مرتبہ دعا کرتے ہیں‘ شام میں عصر کے بعد کے اذکار میں دعا کرتے ہیں۔ رات میں تہجد میں دعا کرتے ہیں:

وَالْجَنَّۃُ حَقٌّ، وَالنَّارُ حَقٌّ ’’اے اللہ! جنت بھی حق ہے۔ اے اللہ! جہنم بھی حق ہے۔‘‘

یہ اللہ کے رسول ﷺ کا معمول تھا۔ میں اور آپ تنہائی میں اپنے آپ کو جہنم سے بچانے کی دعا پورے شعور کے ساتھ اللہ سے روزانہ کتنی مرتبہ کرتے ہیں؟ یہاں شدید گرمی ہے۔ ننگے پیر چلیں تو تپش اس قدر لگے کہ کھوپڑی کھول جائے۔ جہنم کا عالم کیا ہوگا‘ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ’’دنیا کی آگ جہنم کی آگ کا صرف ایک حصہ ہے‘ جب کہ جہنم کی آگ دنیا کی آگ سے ۶۹ گنا زیادہ شدید ہے۔‘‘ ۶۹ فی صد نہیں بلکہ ۶۹ گنا۔ سورۃ النساء میں فرمایا گیا:

﴿كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُوْدُهُمْ بَدَّلْنٰهُمْ جُلُوْدًا غَيْرَهَا لِيَذُوْقُوا الْعَذَابَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝۵۶﴾

’’جب بھی ان کی کھالیں جل جائیں گی ہم اُن کو دوسری کھالیں بدل دیں گے تاکہ وہ عذاب کا مزا چکھتے رہیں۔ یقیناً اللہ زبردست ہے‘ کمالِ حکمت والا ہے۔‘‘

بار بار ان کو نئی کھال دیں گے تاکہ وہ جلنے کے عذاب کو مستقل چکھیں۔ ان کے اوپر بھی آگ ہو گی‘ نیچے بھی آگ ہو گی۔ آگ کے ستونوں پر ان کو باندھ کر عذاب دیا جائے گا۔ کھولتا پانی سروں پر سے بہایا جائے گا۔ کانٹے دار گھاس ان کو کھانے کو ملے گی۔ جہنمیوں کے زخموں کا پیپ ان کو پینا پڑے گا۔ لوہے کے ہتھوڑوں سے ان کو مارا جائے گا۔ یہ قرآن کی آیات میں ہے لکھا ہوا سب کچھ۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا کہ کم ترین عذاب جہنم میں یہ ہے کہ ایک شخص کو انگاروں کی بنی ہوئی جوتیاں پہنائی جائیں گی‘ جس کے تسمے بھی انگاروں کے ہوں گے۔ وہ پہنے گا تو اس کا وجود کھولے گا۔ اس کی کھوپڑی اس طرح کھولے گی جیسے چولہے پر ہنڈیا کھولتی ہے۔ وہ

سمجھے گا کہ یہ جہنم کا سب سے بڑا عذاب ہے‘ حالانکہ یہ جہنم کا کم ترین عذاب ہوگا۔

اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ ! اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ ! اَللّٰھُمَّ اَجِرْنَا مِنَ النَّارِ !

نہیں بتائی جاتیں یہ باتیں۔ عام طور پر یہ حقیقتیں سننے کو نہیں ملتیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے بیان فرمائیں۔ یہ اللہ کے وعدے ہیں جو سچے ہیں۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ﴿١٢٢﴾﴾ (النساء)

’’اور کون ہے جو اللہ سے بڑھ کر اپنی بات میں سچا ہو سکتا ہے؟‘‘

اور:

﴿وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا ﴿٨٧﴾﴾ (النساء)

’’اور اللہ سے بڑھ کر اپنی بات میں سچا کون ہوگا؟‘‘

ایک مرتبہ اماں عائشہؓ روئیں۔ اللہ کے رسول ﷺ نے پوچھا: عائشہ! کیوں روتی ہو؟ میری اور آپ کی ماں نے یہ نہیں کہا کہ حجرہ چھوٹا ہے‘ یا ہمارے گھر میں مال کی فراوانی نہیں ہے‘ یا دو دو مہینے ہمارے گھر میں چولہا نہیں جلتا۔ عرض کی: ’’اللہ کی جہنم کے خوف نے مجھے رُلا دیا۔‘‘ آج ہم بھی روتے ہیں‘ لیکن کن باتوں پر! آئی فون کا نیا ورژن نہیں ملا۔ فلاں بڑے اسکول میں میرے بچے کا ایڈمیشن نہ ہوا۔ ایک کروڑ روپیہ لگا دیا بچے کی شادی پر اور پھر بھی کہہ رہے ہیں کہ بس گزارا کر رہے ہیں۔ اس قدر ناشکری ہے۔ کبھی جہنم کی آگ بھی مجھے اور آپ کو رلاتی ہے؟ اُمّت کی ماں کو تو اس پر رونا آیا۔ اللہ کے رسول ﷺ روتے ہیں رات کو کھڑے ہو کر۔ جو بخشے بخشائے ہیں‘ وہ ایسے روتے ہیں کہ سینے سے اس طرح آواز آتی جیسے ہانڈی کھول رہی ہو چولہے کے اوپر۔ اللہ تعالیٰ ہمیں جہنم کا یقین دے۔ یقین ہوگا‘ ڈر ہوگا تو اس سے بچنے کی کوشش ہوگی۔ قرآن کو سمجھ کر پڑھیں۔ قرآن ہماری بھلائی کے لیے ڈراتا ہے۔

دوسرا نتیجہ جنت کی صورت میں ہے۔ جہاں جہاں اللہ ڈراتا ہے‘ وہاں وہاں جنت کا ذکر بھی فرماتا ہے۔ اللہ کے رسول ﷺ نے جتنا جہنم کے عذابوں سے ڈرایا‘ اس سے بڑھ کر جنت کی نعمتوں کا شوق دلایا۔ قرآن کریم میں جا بجا‘ بار بار جنت کا ذکر آتا ہے۔ پڑھیں تو سہی۔ قرآن ہمیں جنت کی نہروں کا نظارہ کراتا ہے۔ سورۂ محمد میں چار نہروں کا ذکر ہے: صاف شفاف پانی کی نہر‘ صاف شفاف دودھ کی نہر‘ صاف شفاف شہد کی نہر اور پاکیزہ شراب کی نہر۔ ۲۹ ویں پارے کے آخر میں سورۃ الدھر میں جنت کے پاکیزہ مشروب کے فلیورز کا ذکر کیا گیا ہے۔ ہر جنتی

ایک بادشاہ کی طرح ہوگا۔ جنتیوں کو سونے اور چاندی کے کنگن پہنائے جائیں گے‘ کیوں کہ قدیم دور میں بادشاہ کنگن پہنتے تھے۔ قرآن ذکر کرتا ہے جنت کے محلات کا۔ بخاری شریف میں حدیث قدسی ہے‘ اللہ تعالیٰ کا کلام اللہ کے رسول ﷺ نے نقل فرمایا: ’’اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: میں نے اپنے نیک بندوں کے لیے جنت میں وہ کچھ تیار کیا ہے جو کسی آنکھ نے کبھی دیکھا نہیں‘ کسی کان نے کبھی سنا نہیں‘ کسی کے دل میں کبھی اس کا خیال تک نہیں آیا ہوگا۔‘‘ وہاں اللہ تعالیٰ میزبان ہوگا۔ تصور کریں کہ اللہ کے مہمان کے اکرام کا کیا عالم ہوگا! جب فرشتے انسانی شکل میں آئے تھے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں بچھڑے کا گوشت پیش کیا تھا۔ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ’’تمہارا رب آج بھی جنت میں بچھڑوں کو چرا رہا ہے۔ جنتی پہنچیں گے تو ان جنتی بچھڑوں کا گوشت اللہ تعالیٰ ان کو پیش کرے گا۔ اللہ اکبر کبیرا! اللہ کے رسول ﷺ نے کھول کھول کر یہ باتیں بتائیں۔

ایک بوڑھی عورت نے رسول اکرم ﷺ سے کہا: میرے لیے دعا کیجیے میں جنت میں چلی جاؤں۔ حضور ﷺ نے فرمایا: کوئی بوڑھی عورت جنت میں نہ جائے گی۔ وہ رونے لگی تو فرمایا: بوڑھی کو اللہ جوان کر کے داخل کرے گا۔ سنن ابن ماجہ کی روایت کے مطابق‘ جنت والوں کی عمر ۳۳ سال ہوگی۔ خوب بھرپور جوانی۔ کبھی بڑھاپا نہیں آئے گا۔ ہمیشہ زندہ رہیں گے‘ کبھی موت نہیں آئے گی۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ہمیشہ صحت مند رہیں گے‘ کبھی بیماری نہیں آئے گی۔ ہمیشہ خوش حال رہیں گے‘ کبھی مفلسی کا معاملہ نہیں آئے گا۔ مسلم شریف کی روایت ہے‘ اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: آخری بندہ جو اپنی سزا بھگتنے کے بعد جہنم سے نکال کر جنت میں ڈالا جائے گا‘ اس بندے کی جنت ہماری اس دنیا سے دس گنا بڑی ہوگی۔ آخری جنتی کی جنت اس دنیا سے دس گنا بڑی ہوگی تو پہلے والوں کا عالم کیا ہوگا! مقربین کی جنت کا عالم کیا ہوگا! انبیاء کی جنت کا عالم کیا ہوگا! رسول اللہ ﷺ کی جنت کا عالم کیا ہوگا! کسی سے پوچھا گیا: جنت میں ایسا کیا ہے جس کا شوق ہو؟ کہا گیا: جنت میں رسول اللہ ﷺ ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ جنت والوں کو سب کچھ عطا کر دے گا۔ دوسری بات‘ اللہ اپنی رضا کا اعلان فرمائے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰٓاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ﴿٢٧﴾ ارْجِعِيْٓ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِيَةً مَّرْضِيَّةً ﴿٢٨﴾ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبٰدِيْ ﴿٢٩﴾ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ ﴿٣٠﴾﴾

’’اے نفسِ مُطمئنّہ! اب لوٹ جاؤ اپنے رب کی طرف اِس حال میں کہ تم اُس سے راضی‘ وہ تم سے راضی! پس داخل ہو جاؤ میرے (نیک) بندوں میں‘ اور داخل ہو جاؤ میری جنّت میں!‘‘

تیسری اور آخری بات یہ کہ اللہ تعالیٰ حجاب کو ہٹائے گا۔ اللہ پردہ ہٹا دے گا اور اپنا دیدار کرائے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ’’جیسے تم چودھویں کے چاند کی شان کو دیکھتے ہو‘ اپنے رب کا دیدار کرو گے۔‘‘ آج رب کو بن دیکھے نماز میں کھڑے ہو گئے‘ بن دیکھے لبیک پکارنا شروع ہو گئے‘ بن دیکھے فقیرانہ لباس پہن لیا‘ بن دیکھے طواف کے چکر لگ رہے ہیں۔ جس اللہ کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہیں‘ آخری بات یہ کہ اللہ اپنا دیدار کرائے گا۔ اپنے دل سے پوچھیں: اللہ سے ملنا چاہتے ہیں؟ اللہ کا دیدار چاہتے ہیں؟

ہم نے بات شروع کی تھی موت سے۔ میں اپنے آپ سے پوچھوں‘ آپ اپنے آپ سے پوچھیں: ہم مرنے کو تیار ہیں؟ اللہ تعالیٰ سے ملاقات میں موت رکاوٹ ہے۔ مومن موت سے نہیں ڈرتا بلکہ ہر وقت تیار رہتا ہے۔ کیا ہم واقعی مرنے کو تیار ہیں؟ کیا واقعی اللہ تعالیٰ ہمارا مقصودِ اوّل‘ مطلوبِ اوّل‘ محبوبِ اوّل ہے؟ کیا اللہ ہماری ترجیحات میں پہلے نمبر پر ہے؟ کیا ہم واقعی اللہ سے محبت کرتے ہیں؟ کیا ہم واقعی اللہ کو چاہتے ہیں؟ حج کے بعد ہمارے ارادے کیا ہیں؟ حج کے بعد کی زندگی کیسی ہوگی؟ حج کے بعد اعمال کیسے ہوں گے؟ حج کے بعد معاملات کیسے ہوں گے؟ اللہ سبحانہ وتعالیٰ ہم سب کو اپنی رضا عطا فرمائے! اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنا دیدار عطا فرمائے!

❁❁❁

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اَقسامِ شرک

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

اشاعت خاص **400** روپے، اشاعت عام **150** روپے

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں!

ایوب بیگ مرزا

ایران اسرائیل جنگ سے دنیا کے کم و بیش تمام ممالک بُری طرح متاثر ہو رہے ہیں۔ سٹاک مارکیٹیں کریش کر رہی ہیں' سرمایہ کاری کو دھچکا لگا ہے۔ تمام ممالک جنگ کی وجہ سے ہونے والے معاشی نقصانات سے نکلنے کے راستے ڈھونڈ رہے ہیں۔ آبنائے ہرمز کے بند ہونے سے تیل مہنگا ہو گیا ہے۔ تیل صنعت کے پہیے کو رواں دواں رکھنے کے لیے انتہائی اہم ہوتا ہے۔ دنیا بھر کی ٹرانسپورٹ کا زیادہ تر انحصار اسی تیل پر ہے۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس جنگ نے معیشت کی شہ رگ پر پاؤں رکھ دیا ہے' جس سے اس کا دم گھٹنے لگا ہے۔ ماہرین اقتصادیات اپنی اپنی حکومتوں کو اس مصیبت سے نجات پانے یا اس کے اثرات کو کم کرنے کے لیے شب و روز مشورے دے رہے ہیں۔ یورپ میں حکومتیں سر جوڑ کر بیٹھی ہیں اور اپنوں' بیگانوں سب سے تعاون حاصل کر رہی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ مختلف ممالک میں حکومتیں اور اپوزیشن صرف معاشی نہیں بلکہ سیاسی اختلافات کو بھی ایک طرف رکھ کر نئی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے یک جان ہوتی نظر آ رہی ہیں۔ بھارت میں سیاسی اختلافات اگر کم نہیں ہوئے تو کچھ بڑھے بھی نہیں۔ بھارتی حکومت پٹرول کی قیمتوں کو کنٹرول کر کے اپنی صنعت اور زراعت متاثر ہونے سے بچانے کے لیے سرگرداں ہے۔

دنیا بھر میں مملکت خداداد اسلامی جمہوریہ پاکستان شاید واحد ملک ہے جس کی معیشت پہلے ہی ملکی اور غیر ملکی قرضوں پر چل رہی تھی' اب اس جنگ کی وجہ سے حالتِ نزع میں ہے' یہاں تک کہ سالانہ بجٹ کے لیے روز نئی تاریخ دی جا رہی ہے۔ حکومت بے چاری کبھی آئی ایم ایف اور کبھی عوام کی طرف دیکھتی ہے۔ ''نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن'' کی کیفیت ہے۔ اس سب کے باوجود حکومت نہایت ''بہادری اور جرأت'' کا مظاہرہ کر رہی ہے۔ جس پاکستان کو پہلے ہی

سیاسی عدم استحکام کا سامنا ہے‘ حکومت اور عوام میں بُعد المشرقین ہے‘ عوام حکومتی کارندوں اور وزیروں مشیروں کا نام سننے اور دیکھنے کے روادار نہیں‘ قوت اور جبر سے پہلے ان کو حکومت سازی سے لاتعلق کر دیا گیا اور پھر ’’پیکا‘‘ جیسے کالے قوانین بنا کر میڈیا کے ہاتھ پاؤں باندھ دیے اور منہ پر ٹیپ لگا دی۔ اس صورت حال نے ساری قوم کو حبس بے جا کی کیفیت سے دوچار کر رکھا تھا۔ ایسے اقدامات کرنے کی بجائے کہ مفاہمت کی فضا پیدا ہو اور سیاسی کشیدگی میں کمی آئے‘ تیر و تفنگ سے کام لیتے ہوئے سیاسی جنگ و جدل کو ہوا دی جا رہی ہے۔ پہلے گلگت بلتستان کے الیکشن میں عوامی رائے عامہ کو بُری طرح کچل دیا گیا۔ پھر وہ کشمیر جسے ہم اپنی شہ رگ قرار دیتے ہیں‘ اس پر تیز دھار آلہ رکھ دیا گیا جس سے حقیقت میں پاکستان کی سلامتی کو شدید خطرات لاحق ہو گئے ہیں۔ دوسری جانب تحریک انصاف کے سربراہ کو حقیقت میں حبس بے جا میں رکھا ہوا ہے۔ اس پر ۳۰۰ سے زائد مقدمات دائر ہیں‘ جن میں سے کوئی ایک بھی ثابت نہیں ہو رہا۔ گویا ایران اسرائیل جنگ تو پاکستان کی صرف معاشی بنیادوں کو کھوکھلا کر رہی ہے جبکہ گلگت بلتستان میں عوامی مینڈیٹ کی توہین‘ کشمیر میں عوام کی جکڑ بندی اور منہ زور قوت کے استعمال‘ خیبر پختون خوا میں تحریک انصاف کو کارنر کرنے کے طرزِ عمل نے بڑا بگاڑ پیدا کر دیا ہے۔ علاوہ ازیں‘ بلوچستان میں بی ایل اے کی کھلی بغاوت اور دہشت گردی کی کارروائیوں نے ریاست کے وجود پر خطرے کا بڑا نشان لگا دیا ہے۔

جہاں تک ایران اسرائیل جنگ کا تعلق ہے‘ راقم پہلے ہی مختلف مواقع پر عرض کر چکا ہے کہ ۱۸۸۷ء کے پروٹوکولز کے بطن سے جنم لینے والے صہیونیوں کے گروہ نے عالمی سطح پر اپنی مکمل بالادستی کا ایک پروگرام وضع کیا۔ اسرائیل کا قیام اور پھر گریٹر اسرائیل کی شکل میں اس کی توسیع اسی پروگرام کا حصہ ہے۔ اس کو عملی شکل دینے کے لیے پہلے یہودی سرمائے کے زور پر امریکی تجارت اور صنعت میں قدم جمائے گئے۔ پھر میڈیا پر قبضہ کر کے اپنے خیالات اور نظریات دنیا بھر خاص طور پر امریکہ اور یورپ میں انجیکٹ کرنے شروع کیے۔ وہاں کی حکومتوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انہیں یہودیوں کے مفاد میں استعمال کرنا شروع کیا۔ ہولوکاسٹ کا ڈھنڈورا پیٹ کر کئی دہائیوں سے دنیا کی مظلوم ترین قوم بنے ہوئے تھے جبکہ حقیقت میں وہ مظلوم نہیں بلکہ ظالم ہیں۔ غزہ کی جنگ میں انہوں نے جو انسانیت سوز ظلم کیے‘

جبر و تشدد کی جو نئی تاریخ رقم کی اور بچوں‘ عورتوں‘ بوڑھوں کو جس طرح سر بازار ذبح کیا‘ یہ درندگی اپنی مثال آپ ہے۔ ہسپتالوں پر بمباری کر کے مریضوں کو موت کے گھاٹ اتارا گیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ اسرائیل امریکہ پر اس قدر حاوی ہو گیا کہ راقم کو ایک موقع پر کہنا پڑا کہ امریکہ کو اگر واشنگٹن یا تل ابیب میں سے کسی ایک کا تحفظ کرنا ہو گا تو وہ تل ابیب کے دفاع کو ترجیح دے گا۔ نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ امریکہ کے صدارتی انتخابات میں امیدوار ری پبلکن ہو یا ڈیموکریٹ‘ اسے اسرائیل سے این او سی لینا پڑتا ہے۔ ہر امیدوار اپنی انتخابی مہم میں یہ ثابت کرنے کی سر توڑ کوشش کرتا ہے کہ وہ امریکہ کا صدر بن کر اسرائیل کے مفادات کا زیادہ تحفظ کرے گا۔ صدر نکسن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ بیسویں صدی میں امریکہ کا بہترین صدر تھا جس نے اپنے ملک کو مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ وہ نکسن بھولے سے فلسطینیوں کے حق میں بیان دے بیٹھا۔ یہودیوں نے اس کا وہ حشر کیا کہ واٹر گیٹ سکینڈل بنا کر کانگرس سے مواخذہ کروا دیا۔ دُنیا نے دیکھا کہ جب نکسن وائٹ ہاؤس سے نکلا تو اس کے آنسو بہہ رہے تھے۔ صدر کلنٹن کو بھی اپنے سامنے ہاتھ جوڑنے پر مجبور کیا۔ یہی حال یورپ کے کئی حکمرانوں کا ہوا۔ دراصل امریکی اکانومی اور میڈیا پر صہیونی قبضہ جما چکے ہیں۔ اسرائیل پچھلے چند امریکی صدور کو ایران پر حملہ کرنے کی ترغیب دے رہا تھا‘ لیکن وہ ٹال مٹول کر رہے تھے۔ صدر ٹرمپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے انتخابات سے پہلے اسرائیل کا خفیہ دورہ کیا‘ جس میں سب کچھ طے ہوا۔ تب صہیونیوں نے انتخابات میں اس کی مدد کی اور امریکہ کا صدر بنا دیا۔ شنید یہ ہے کہ اسی دورے میں صدر ٹرمپ سے یہ یقین دہانی بھی لے لی گئی تھی کہ وہ ایران پر حملہ کرے گا۔ موجودہ جنگ کی صورت میں وہی وعدہ وفا کیا جا رہا ہے۔ گویا اسرائیل نے اپنے مفاد میں اور ٹرمپ نے صدر بننے کے لالچ میں دنیا کو اس جنگ میں دھکیل دیا جس کو آج سب بھگت رہے ہیں۔

امریکہ اور اسرائیل سیز فائر کے جھانسے کو بالآخر ختم کر کے ایران پر دوبارہ حملہ آور ہو چکے ہیں۔ صدر ٹرمپ نے دورانِ مذاکرات ایران سے سیز فائر قائم رکھنے کی ایک شرط یہ عائد کر دی کہ مسلمان ممالک ابراہیم معاہدے پر دستخط کریں گے۔ سعودی عرب اور پاکستان کا خاص طور پر نام لیا کہ یہ دونوں اس کا لازمی حصہ بنیں۔ راقم کی رائے میں اصلی بات یہ تھی کہ صدر ٹرمپ کو یہ خطرہ محسوس ہوا تھا کہ وہ مذاکرات اور سفارت کاری کا جو ڈرامہ رچا رہے ہیں‘ کہیں مسلم ممالک

ایران سے ساری شرائط منوا کر جنگ کے مستقل خاتمے پر راضی نہ کر لیں۔ یوں اسرائیل جنگ کے ذریعے جو مقاصد حاصل کرنا چاہتا ہے‘ وہ حاصل نہ ہو سکیں گے۔ لہٰذا ایسی شرط نتھی کر دو جس پر ایران کے لیے عمل کرنا ممکن نہ ہو۔ جنگ پورے زور شور سے دوبارہ شروع ہو چکی ہے۔ اللہ بہتر جانتا ہے کہ دنیا پر کیا گزرتی ہے۔

جنگ تو ایسی مصیبت ہے جو باقی دنیا کے ساتھ پاکستان بھی بھگت رہا ہے۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہم نے داخلی سطح پر کچھ اضافی مسائل خود بھی کھڑے کر لیے ہیں‘ خاص طور پر ان علاقوں میں جہاں بھارت پاکستان کے ساتھ ایک عرصے سے خوامخواہ کے جھگڑے میں ملوث ہے۔ ان میں سے ایک گلگت بلتستان ہے۔ چند روز قبل وہاں انتخابات کروائے گئے جن میں حکومتی اتحادی جماعتوں پاکستان پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ (نون) نے تو زور شور سے حصہ لیا لیکن تحریک انصاف کے لیے جی بی کو ’’نو گو ایریا‘‘ بنا دیا گیا۔ ان کے لیڈروں کو وہاں داخل نہیں ہونے دیا گیا۔ انہیں فروری ۲۰۲۴ء کے انتخابات کی طرح کوئی انتخابی نشان الاٹ نہ کیا گیا۔ چنانچہ انہوں نے مختلف نشانوں سے انتخابات میں حصہ لیا۔ ان کا دعویٰ ہے کہ سخت ترین پابندیوں کے باوجود ان کی جماعت زیادہ نشستیں حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی لیکن پی پی کو سب سے زیادہ سیٹیں دے دی گئیں۔ یہ کوئی معمولی اور چھوٹی بات نہیں ہے۔ ایک ایسے علاقے میں جس کے بارے میں بھارت اگرچہ غلط طور پر ہی سہی‘ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اُس کا حصہ ہے‘ اگر عوام کے حقیقی نمائندوں کو قبول نہیں کیا جائے گا تو اس سے خود پاکستان کی پوزیشن خراب ہو گی۔

پھر یہ کہ کون نہیں جانتا کہ کشمیر ایک بڑا نازک مسئلہ ہے جو پاکستان اور بھارت کے درمیان اصل تنازع ہے۔ یہ کئی مرتبہ دونوں ممالک کو جنگ کی طرف لے جا چکا ہے۔ اس پس منظر میں کہ دُنیا ایران اسرائیل جنگ کے معاشی نتائج سے نمٹنے کی کوشش کر رہی ہے‘ ہم نے آزاد کشمیر میں عوام سے ٹکراؤ شروع کر دیا ہے۔ جوائنٹ عوامی ایکشن کمیٹی کے حوالے سے حکومت کا طرزِ عمل ناقابل فہم ہے۔ اِسے کالعدم قرار دے دیا گیا ہے۔ کالعدم قرار دینے سے ایک دن پہلے تک ان کے حکومت پاکستان سے مذاکرات چل رہے تھے لیکن مذاکرات کے ناکام ہوتے ہی جوائنٹ عوامی ایکشن کمیٹی دہشت گرد ہو گئی۔ لہٰذا اب وہ ۲۷ جولائی کو کشمیر میں ہونے

والے انتخابات میں حصہ نہیں لے سکتے۔ اس پر کشمیری عوام کا انتہائی شدید ردِعمل سامنے آیا۔ پھر سرکاری اہل کاروں کے ہاتھوں راولاکوٹ کے ایک شہری کی ہلاکت نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور اب وہاں حالات مکمل طور پر بے قابو ہو چکے ہیں۔ کشمیری نوجوان لانگ مارچ کرتے ہوئے راولاکوٹ کی طرف بڑھ رہے ہیں اور پھر کشمیر کے دوسرے اطراف سے عوام مل کر مظفر آباد جمع ہوں گے۔ حکومت پاکستان میڈیا پر مکمل پابندی عائد کر کے خبریں باہر نہیں آنے دے رہی اور حالات کے نارمل ہونے کا تاثر دے رہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب میڈیا پر پابندی لگ جاتی ہیں تو افواہ سازی خوب کمال دکھاتی ہے جس سے ملک میں خوف و ہراس پھیل جاتا ہے۔ پھر یہ کہ دنیا بھر کا میڈیا عوامی بے چینی اور حالات کی خرابی کی خبریں دے رہا ہے۔ کشمیر میں تو انٹرنیٹ بند کر دیا گیا ہے لیکن کشمیری اس کا حل یہ نکال رہے ہیں کہ وہ خیبر پختونخوا کی سرحد پر پہنچ جاتے ہیں، جہاں انٹرنیٹ آسانی سے دستیاب ہے۔ وہاں سے جو پریشان کن بلکہ لرزہ خیز خبریں وہ دے رہے ہیں اس سے بڑی تشویش پھیل رہی ہے۔

بتایا یہ جا رہا ہے کہ اختلاف ان ۱۲ نشستوں پر ہے جو کشمیر سے باہر رہائش پذیر کشمیریوں کے لیے مختص ہیں۔ انہیں مہاجروں کی نشستیں کہا جاتا ہے۔ جوائنٹ ایکشن کمیٹی کا مطالبہ یہ ہے کہ یہ نشستیں ختم کر دی جائیں جبکہ حکومت پاکستان ایسا نہیں کرنا چاہتی۔ اس کا ایک حل یہ سامنے آیا ہے کہ ۲۷ جولائی کے انتخابات میں امیدوار کے بیلٹ پیپر کے ساتھ ووٹ دہندگان کو کہا جائے کہ ایک الگ ووٹ میں وہ ۱۲ نشستوں کے بارے میں بھی اپنی رائے کا اظہار کر دیں۔ یہ ایک طرح کا عوامی ریفرنڈم ہو جائے گا۔ راقم کی رائے میں عوامی رائے کا مکمل احترام ہونا چاہیے اور کوئی شے زبردستی مسلط نہیں کی جانی چاہیے۔ دعا ہے کہ جب کشمیر کے تمام اطراف سے عوام مظفر آباد پہنچیں تو معاملات خیر و عافیت سے طے ہو جائیں۔ کسی کا بھی خون نہ بہے۔ سرکاری اہل کار بھی مسلمان ہیں جو اپنی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں اور جوائنٹ ایکشن کمیٹی بھی اپنے کشمیری بھائیوں پر مشتمل ہے۔

ہمارا ایک بیرونی مسئلہ افغانستان سے پھڈا ہے۔ ایک طرف افغان طالبان ہیں جو بدقسمتی سے بت پرست ہندو حکومت کے ساتھ کھڑے ہیں اور دوسری طرف پاکستان ہے جو افغانستان کے حوالے سے کبھی strategic depth کا تصور رکھتا تھا اور اب اسے سرنگوں کرنے کا

خواہش مند ہے۔ راقم کی رائے میں غلطی دونوں طرف کی نظر آتی ہے۔ پاکستان کو خارجی سطح پر بڑے چیلنجز کا سامنا ہے اور اسرائیل اپنی جنگ کو پاکستان کے صحن تک لے آیا ہے' لہٰذا دور اندیشی کا تقاضا یہی ہے کہ افغان طالبان کے حوالے سے برداشت کا مظاہرہ کیا جائے۔ ایک تو بہرحال وہ مسلمان بھائی ہیں' دوسرے یہ کہ مصلحت اسی میں ہے کہ حکومت اتنے زیادہ محاذ نہ کھولے کہ کہیں بھی صحیح طور پر نمٹا نہ جا سکے۔

داخلی سطح پر ایک مسئلہ جو قریباً ساڑھے تین سال سے الجھا ہوا ہے' وہ حکومت اور تحریک انصاف کے شدید اختلافات ہیں۔ تحریک انصاف کی خیبر پختونخوا میں حکومت بھی قائم ہے جسے بار بار کی کوششوں کے باوجود ختم نہیں کیا جا سکا۔ المیہ یہ ہے کہ پاکستان کا یہ صوبہ افغانستان کے ساتھ جُڑا ہوا ہے۔ اگر حکومت پاکستان اپنی اس صوبائی حکومت سے بھی سوتیلا پن ختم نہیں کرتی اور افغان طالبان کی حکومت پر بمباری بھی کرتی ہے تو سوچنا ہوگا کہ کل کلاں اگر معاملات زیادہ بگڑ جاتے ہیں تو کیا حکومت پاکستان کو ان کے کسی قسم کے باہمی تعاون سے بہت بڑا نقصان تو نہیں اُٹھانا پڑے گا! لہٰذا فی الحال افہام وتفہیم سے کام لینے میں ہی ہماری بہتری ہے۔ مقتدر طبقات اس بات پر سنجیدگی سے غور کریں کہ ایک جماعت جو ملک کے طول وعرض میں پاپولر ہے' اس کی حمایت کے بغیر ملک کب تک چلایا جا سکے گا۔ اِس حوالے سے کچھ اچھی خبریں بھی سامنے آ رہی ہیں کہ ریاست افہام وتفہیم کے لیے کچھ مثبت اقدام کرتی نظر آ رہی ہے۔ اللہ کرے کہ ذاتی مفادات کو تج کے اِس حوالے سے ایسے فیصلے کیے جائیں جن سے ملک میں سیاسی استحکام پیدا ہو سکے۔

شریف اور زرداری جیسی تجربہ کار فیملیز کی حکومت پاکستان میں ہر سطح خاص طور پر معاشی سطح پر بری طرح ناکام نظر آ رہی ہے۔ راقم کی رائے میں کسی غیر مقبول حکومت کے ہوتے ہوئے ملک میں بیرونی سرمایہ کاری نہیں آئے گی۔ موجودہ حکومت کی نااہلی کی وجہ سے ملکی اور غیر ملکی قرضے بہت بڑھ چکے ہیں۔ مقامی اور بیرونی بینکوں سے شارٹ ٹرم قرضے بہت بڑی شرح سود پر لیے گئے ہیں اور یہ بوجھ ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا ہے۔ لہٰذا ہوش مندی سے کام لینے کی ضرورت ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ کسی غریب اور مقروض ملک کی حکومت اگر عوام کی چنیدہ اور پسندیدہ نہیں ہے تو وہ غیروں کے سہارے خود کو قائم رکھنے کی کوشش کرتی ہے۔ فری لنچ کا رواج

دُنیا میں کہیں بھی نہیں ہے۔ چین بھی نرم خُو تو ہے لیکن گانٹھ کا بڑا پکا ہے۔ زبان نرم، عمل سخت۔ لہٰذا ایک ہی حل ہے کہ عوام اور حکومت کا بُعد ختم ہو۔ عوام کی چنیدہ اور پسندیدہ حکومت قائم کی جائے۔ اس حوالے سے انتہائی غیر جانب داری اور دیانت داری کا مظاہرہ کیا جائے۔ انا کا مسئلہ نہ بنایا جائے۔ پاکستان کے وجود ہی سے سب خیر و عافیت سے رہ سکیں گے۔

جہاں تک بلوچستان میں حالات کی خرابی کا تعلق ہے، حکومت کا حال یہ ہے کہ ایک وزیر کہتا ہے کہ بلوچستان میں دہشت گردی کرنے والے اور حالات کو بگاڑنے والے ایک ایس ایچ او کی مار ہیں۔ اس بیان کی جتنی مذمت کی جائے، کم ہے۔ حالات یہ ہیں کہ بی ایل اے جو ایک اعلانیہ پاکستان دشمن اور دہشت گرد تنظیم ہے، اس نے بلوچستان کے بعض علاقوں میں ناکے لگائے ہوئے ہیں اور ملک دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ وفاقی یا صوبائی حکومت ان کا کچھ بگاڑنے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ خیبر پختون خوا میں کئی علاقے ہیں جہاں سرکاری اہل کاروں کو داخل ہونے میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔

ہمارا عجب معاملہ ہے کہ اپنا آپ سنبھالا نہیں جا رہا، دنیا بھر میں صلح صفائی کے لیے زبردست سفارت کاری کر رہے ہیں۔ راقم کی رائے میں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جن ممالک میں صلح صفائی کے لیے ہم سفارت کاری کر رہے ہیں ان میں ایک فریق پاکستان کی جان اور سلامتی کا سب سے بڑا دشمن ہے۔ امریکہ کے بارے میں اس کے اپنے سپوت ہنری کسنجر نے کہا تھا کہ امریکہ کے دوست کو دشمن سے کہیں زیادہ بڑا خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ جب آسمان کے نیچے اور زمین کے اوپر سب سے بڑا جھوٹا انسان یعنی امریکی صدر ٹرمپ پاکستان کی سیاسی اور عسکری قیادت کی تعریفوں کے پل باندھتا ہے تو راقم کا دل بیٹھ جاتا ہے اور ریاست پاکستان اور اس کے بعد ان کے لیے خیر و عافیت کی دعا کرتا ہے۔ ٹرمپ ایک ایسا انسان ہے جس کے بارے میں اخباری اطلاعات یہ ہیں کہ گزشتہ تین ماہ میں ۳۸ بار یہ کہہ چکا ہے کہ امریکہ اور ایران معاہدہ کے قریب پہنچ چکے ہیں، بس معمولی اختلاف ہے جو جلد رفع ہو جائے گا۔ پھر چند دن بعد گالیاں نکال کر حملہ کر دیتا ہے۔ شرم نام کی چیز اس کے پاس سے نہیں گزری۔ جب اس تحریر کا آغاز کیا گیا تھا تو جنگ دوبارہ شروع کرنے کا زبردست اعلان تھا اور عملی طور پر کچھ حملے کیے بھی گئے۔ اب جب یہ تحریر آخری مراحل میں ہے تو معاہدے کا اعلان ہو رہا ہے۔ ظاہری طور پر تو یوں لگتا ہے کہ یہ

شخص سٹھیا گیا ہے۔ وہ دنیا کو بے وقوف بناتا ہے۔ اسے ہرگز اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ اس کی لغو باتوں سے امریکہ جیسی سپر پاور کا امیج اور حیثیت کس قدر متاثر ہوتی ہے۔ دنیا کے نزدیک امریکہ کے صدر کا منصب بری طرح عیاں ہوا ہے۔

تحریر یہاں تک پہنچی تھی کہ خبر آئی امریکہ اور ایران کے درمیان معاہدہ ہو گیا ہے اور وہ جنگ بند کر رہے ہیں۔ ظاہری طور پر تو یہ ایک اچھی خبر ہے لیکن تمام حالات کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو یہ eye wash معلوم ہوتی ہے۔ ٹرمپ امریکی عوام اور یورپ کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ تو امن کا قائل ہے۔ G7 کی میٹنگ کے دوران سائیڈ لائن پر وہ عرب سربراہوں سے مل کر انہیں دوبارہ قابو کرنے کی کوشش کرے گا جو امریکہ کے ہاتھ سے نکلتے نظر آ رہے ہیں۔ اسرائیل کسی مفاہمتی فارمولے بلکہ اس کے لیے جاری کوششوں کی رتی بھر پروا نہیں کرے گا اور لبنان پر حملے جاری رکھے گا۔ معاہدے کے بعد اسرائیلی وزیراعظم اور وزراء اس قسم کے بیانات دے رہے ہیں کہ ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ ٹرمپ کی عیاری بھی نظر آ رہی ہے کہ اسرائیل سے معاہدے پر دستخط نہیں کروائے گئے۔

اسی دوران حکومت نے بجٹ قومی اسمبلی میں پیش کر دیا ہے۔ گویا مہنگائی سے نیم بے ہوش عوام کے سر پر مزید ٹیکس لاد دیے گئے ہیں۔ بجٹ پر بات کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم خاص طور پر اس حوالے سے غور کر لیں کہ موجودہ حکومت کے آغاز میں کیا صورت حال تھی اور اب کیا ہے۔ ۲۰۲۲ء میں جب شہباز شریف وزیراعظم بنے تو پاکستان پر کُل قرضہ ۳۴ ہزار ارب تھا۔ جی ڈی پی ۶۰۲ء تھی' ڈالر ۱۷۶ء۷۴ روپے کا تھا۔ یہ قرضہ چار سال میں ۸۵ ہزار ارب تک پہنچ گیا ہے۔ قرضوں کی تاریخ اگر ۱۹۵۸ء سے شروع کی جائے تو ۲۰۲۲ء تک ۶۴ سال میں ۳۴ ہزار ارب یعنی دو ہزار ارب روپے سے معمولی زائد سالانہ اضافہ بنتا ہے۔ گزشتہ چار سال میں یعنی ۲۰۲۲ء سے ۲۰۲۶ء تک ۳۴ ہزار ارب سے ۸۵ ہزار ارب تک پہنچ گیا یعنی ۵۱ ہزار ارب بڑھ گیا۔ گویا سالانہ بڑھوتری ساڑھے ۱۲ ہزار ارب ہو گئی۔ ناقابلِ یقین حد تک اس قدر قرضہ بڑھنے کے باوجود نئی انڈسٹریز نہ لگ سکیں بلکہ کئی انڈسٹریز بند ہو گئیں۔ بہت سے سرمایہ کار دوسرے ممالک میں چلے گئے۔ گویا حقیقت میں ترقی معکوس کا معاملہ ہے۔

ایس آئی ایف سی کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا گیا تھا' جسے پاکستان میں بیرونی سرمایہ

کاری لانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔ وزیراعظم شہباز شریف نے ان چار سالوں میں ۳۰۰ غیر ملکی دورے کیے' یہاں تک کہ ان کے بارے میں مشہور ہو گیا کہ وہ کبھی کبھی پاکستان کا دورہ بھی کرتے ہیں۔ ان دوروں پر بہت زیادہ زرِمبادلہ خرچ ہوا' جس کی تفصیل حاصل نہیں ہو سکی۔ سعودی عرب سے دفاعی معاہدے کے نتیجہ میں ان کے پہلے سے موجود تین ارب ڈالر کے علاوہ پانچ ارب ڈالر بطور امانت پاکستان کے خزانے میں آ گئے۔ اس سے آئی ایم ایف کا ایک مطالبہ پورا ہو گیا کہ پاکستان کے خزانے میں اتنی رقم ہونی چاہیے۔ اس امانت پر ہم سعودی عرب کو چھ فیصد سالانہ سود ادا کرتے ہیں۔

یہ تھی پاکستان کی تباہ شدہ معاشی صورت حال! موجودہ بجٹ میں چند ایک اچھی باتیں بھی ہیں۔ مثلاً تنخواہ داروں پر انکم ٹیکس کا بوجھ کم کیا گیا ہے۔ تاجروں اور صنعت کاروں کو کچھ ریلیف دیا گیا ہے۔ چھوٹے تاجروں پر فکس انکم ٹیکس لگا دیا گیا ہے تاکہ وہ ایف بی آر کی چیرہ دستیوں سے بچ سکیں۔ البتہ بحیثیت مجموعی یہ عام آدمی کے لیے ایک ڈراؤنا اور خوف ناک بجٹ ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ وزیراعظم صاحب سے یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ ۸۳۶۷ روپے آمدن والا آدمی غریب نہیں ہوتا۔ حقیقت میں بین الاقوامی مہاجن نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھے ہوئے ہیں اور ہمیں زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔ پرانے زمانے کے مہاجن کا معاملہ یہ تھا کہ اگرچہ اس کی شرح سود زیادہ ہوتی تھی لیکن اسے اس امر سے کوئی غرض نہیں ہوتی تھی کہ مقروض قرض کی رقم کیسے اور کہاں خرچ کرے گا۔ یہ ماڈرن مہاجن لاٹھی لیے ہر وقت ہمارے سر پر کھڑا رہتا ہے اور ڈکٹیٹ کرتا ہے کہ قرض کی رقم کہاں خرچ ہو سکتی ہے اور کہاں نہیں۔ پاکستان کا پٹرول کا ماہانہ بل ۲ء۲۷ بلین ڈالر ہوتا ہے۔ پٹرول سے فضائی آلودگی کا مسئلہ بھی کھڑا ہو جاتا ہے۔ چین نے اپنی پوری توجہ اس طرف مبذول کی ہوئی ہے کہ الیکٹرانک گاڑیاں اور ٹرک تیار کرے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ ایسی گاڑیوں پر ٹیکس کم کیا جائے تاکہ پاکستان پٹرول کے اتنے بڑے بل میں زیادہ سے زیادہ کمی کر سکے' لیکن آئی ایم ایف نے الیکٹرانک وہیکلز پر ٹیکس کم کرنے کی اجازت نہیں دی کیونکہ اس سے پاکستان کے ساتھ امریکہ کے دشمن چین کو بھی فائدہ پہنچتا تھا۔ ہم نے ''یس سر'' کہہ کر یہ ٹیکس کم نہیں کیا۔ گویا ہم پٹرول کا بھاری بھرکم بل بھی ادا کرتے رہیں گے اور پاکستان کی فضاؤں کو آلودہ بھی کرتے رہیں گے۔ بجٹ میں تنخواہ اور پنشن میں سات فیصد اضافہ

کیا گیا جبکہ مہنگائی بڑھنے کا تناسب اس سے کہیں زیادہ ہے۔ دفاعی بجٹ بڑھایا گیا ہے جس کی مخالفت نہیں کی جاسکتی‘ لیکن سیاسی عدم استحکام ملکی سلامتی کے لیے بڑا خطرہ ہے۔ بیکری کی اشیاء اور گھریلو استعمال کی اشیاء پر ۱۸ فیصد جی ایس ٹی لگا دیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں بجٹ میں ۱۵۰ ارب کے نئے ٹیکس لگائے گئے ہیں جن میں انسانی بنیادی ضروریات کی اشیاء بھی شامل ہیں مثلاً گھی‘ خوردنی تیل۔ یہ فہرست اتنی بڑی ہے کہ تحریر بہت طویل ہو جائے گی۔ اس سب کچھ کے باوجود حسب معمول حکومت کا دعویٰ ہے کہ غریب آدمی متاثر نہیں ہوگا۔ قصہ کوتاہ دہشت گردی‘ سیاسی عدم استحکام‘ کشمیر میں بڑھتی ہوئی عوامی تحریک‘ گلگت بلتستان میں ہونے والے انتخابات پر ردعمل اور نہ جانے کتنے داخلی مسائل میں گھرے ہوئے پاکستان کے عوام کو اس بجٹ سے مزید تکلیف اور پریشانی میں دھکیل دیا گیا ہے۔ مسائل اور مصائب کے انبار سے غالب کا یہ شعر زبان پر آرہا ہے: ؎

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں!

اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کو معاف کرے‘ پاکستان پر رحم فرمائے اور ہمیں اس امر پر سنجیدگی سے غور کرنے کی توفیق دے کہ ہماری زبوں حالی کے کیا اسباب ہیں!

(یہ تحریر ۱۶ جون ۲۰۲۶ء کو اپنی حتمی شکل میں پہنچی۔)

قارئین توجّہ فرمائیں!

’’میثاق‘‘ میں شامل ایسے مضامین جن کے مصنفین/مرتّبین کا تعلق ہمارے ادارے سے نہیں ہے‘ انہیں قارئین کی معلومات میں اضافے کے لیے شامل کیا جاتا ہے۔ اشاعت سے قبل ان میں لسانی‘ واقعاتی اور زمانی اعتبارات سے ممکنہ حد تک اصلاح بھی کی جاتی ہے۔ تاہم تحریر کے انداز‘ اس میں دی گئی تفصیلات اور اسے مرتّب کرنے کے مقصد کے حوالے سے سوالات/اعتراضات کا جواب دینے کی ذمہ داری ادارے پر عائد نہیں ہوتی۔ ایسے مصنفین کی آراء سے ادارے کا مکمل طور پر اتفاق بھی کوئی لازمی امر نہیں ہے۔ اس ضمن میں صاحبِ تحریر ہی سے رجوع کیا جانا چاہیے‘ جس کا فون نمبر/ای میل/پتہ وغیرہ تحریر کے آغاز میں دے دیا جاتا ہے۔ شکریہ!

PHARMA

Your Health
Our Devotion

NABIQASIM INDUSTRIES (PVT.) LTD.

Leading Pharmaceutical Manufacturing & Marketing Company, offering wide range of high quality branded generics in all therapeutic categories for domestic and international markets. Specializes in manufacturing complete range of Oral Solid Dosage, Syrups, Freeze Dried Lyophilized Injectables, Laxative Enemas, Effervescent Sachets, Dry Suspensions, Creams, Gels, Ointments, Vaginal Tablets including Hormonal Products, Oral Cephalosporin, Ophthalmic and Otic Drops, Creams and suspensions at its cGMP compliant manufacturing facility at Karachi, Pakistan. The company exports its branded generics to more than 40 countries in Asia, CIS, Middle East, Francophone Africa, Fareast, East & West Africa

INNOVATION TECHNOLOGY COMPLIANCE

www.nabiqasim.com

Kausar
BANASPATI & COOKING OILS
کچھ خاص ہمارے کھانے میں

KausarCookingOils

Pakistan Standards

July 2026
Vol. 75

Monthly Meesaq Lahore

Regd. CPL No.115
No.7